علماء کا مقام

اور

ان کی ذمہ داریاں

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

علماء کا مقام

اور ان کی ذمہ داریاں

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

مرتب

[illegible]

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ - اگست ۲۰۱۲ء

کتاب	:	علماء کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں
مصنف	:	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ترتیب	:	عبدالباری اعظمی ندوی
صفحات	:	۱۹۴
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)
سیٹنگ	:	سید محمد مکی حسنی ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی

☆ مکتبہ ندویہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ☆ الفرقان بک ڈپو نظیر آباد لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہرست

علمائے دین کا منصب استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع
(۴۴-۵۲)

حالات کا نیا رخ اور علمائے دین کی ذمہ داری

(۵۳-۶۲)

موجودہ دور کے بے چین ذہنوں کو مطمئن کرنا علماء کی سب سے بڑی ذمہ داری

(۶۳-۷۳)

یہ دین زندہ ہے اور زندوں سے قائم ہے

(۷۳-۸۲)

عہد حاضر کا چیلنج اور علماء کے فرائض

(۸۳-۹۵)

عصر حاضر کا جدید چیلنج اور علماء و اہل مدارس کی ذمہ داریاں

(۹۶-۱۰۴)

پیام راہ

(۱۰۵-۱۱۷)

ایک آزاد ملک میں علماء کی ذمہ داری اور ان کی مطلوبہ صفات

(۱۱۸-۱۲۹)

علماء اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

(۱۳۹-۱۳۰)

غیرتِ صدیقی پیدا کیجیے!

(۱۵۳-۱۴۰)

دینی تعلیمی تحریک کا پیغام اور علماء کی ذمہ داریاں

(۱۶۳-۱۷۴)

حاملین علم اور اہل حق کے ساتھ آزمائشیں

(۱۸۳-۱۷۵)

بنگلہ دیش میں اہل علم و فکر کی ذمہ داری بنگلہ زبان میں مہارت و قیادت

(۱۹۰-۱۸۴)

قوم میں علماء کا منصب و مقام اور عوام میں ان کے بے اثر ہونے کے اسباب

(۱۹۲-۱۹۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

علماء کے موضوع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تقریروں اور قدیم تحریروں سے جو مجموعے تیار کیے گئے ہیں، ان میں یہ چوتھا مجموعہ ہے، جو علماء کے مقام اور ان کی ذمہ داریوں سے متعلق ہے۔ امت مسلمہ کی قیادت کا فریضہ ہمیشہ علماء نے انجام دیا ہے اور ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے ایسے علماء پیدا فرمائے ہیں جنھوں نے امت کو خطرات سے نکالا ہے، اور اس کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگانے کی کوشش کی ہے۔ اسلام کی تاریخ ایسے باخدا افراد سے بھری ہے جنھوں نے حالات کو سمجھا ہے اور اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑنے کے لیے اور ان کو صحیح رخ پر ڈالنے کے لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں، جو اسلامی تاریخ کا زریں باب ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات بھی ایسے ہی علماء ربانیین اور مجددین و مصلحین کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس نے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں اور دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کے ہر طبقہ کو رہنما خطوط دیے ہیں، اور پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا ہے، حضرت مولانا کی تحریروں اور تقریروں کا ایک اہم موضوع یہ بھی رہا ہے علماء کو ان کے منصب و مقام سے آگاہ کرنا اور ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلانا ہے۔

حضرت مولانا نے حالات کی روشنی میں علماء کے لیے ان کے کام کی نوعیت واضح فرمائی ہے، ان کی زندگی کا مقصد اور ان کا مرکز عمل بتایا ہے، اور دعوت الی اللہ، اشاعت علم دین کا

طرف ان کو خاص طور پر متوجہ کیا ہے، اور اس کے لیے علمائے حق کے صبر و عزیمت اور ثبات و استقامت کی مثالیں پیش فرمائی ہیں، اور عمل کے اعتبار سے بھی ان کو اعلیٰ معیار پر رہنے کی تلقین کی ہے اور ان کو امت کے لیے "قطب نما" قرار دیا ہے۔

پیش نظر کتاب میں اسی موضوع پر حضرت مولانا کے مختلف مضامین اور تقریروں کو یکجا لیا گیا ہے، جو مختلف رسائل میں منتشر تھے، تاکہ اس سے استفادہ آسان ہو، اور اس کا نفع عام ہو، عزیز القدر مولوی عبدالہادی اعظمی ندوی شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے یہ اہم کام بڑی مستعدی کے ساتھ انجام دیا، عزیز القدر مولوی محمد نفیس خاں ندوی اور مولوی محمد [illegible] حسنی سلمہما بھی اس کام میں شریک ہیں کہ انھوں نے طباعت کے مراحل اپنے سر لے لیے، اللہ تعالیٰ سب کو بہترین جزا عطا فرمائے، اور کتاب کے نفع کو عام فرمائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مرکز الامام ابی الحسن الندوی

دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

۲۵ رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ

علمائے ربانی

ان کا منصب اور ان کے کام کی نوعیت

علمائے حق کی زندگی کا مقصد اور ان کا مرکز سعی و عمل

علمائے حق، حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث و جانشین ہیں "اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ"[1] ان کی وراثت اور نیابت اسی وقت صحیح اور مکمل ہوگی جب ان کی زندگی کا مقصد اور ان کی کوششوں کا مرکز وہی ہوگا جو انبیائے کرام کا تھا، وہ مقصد زندگی اور وہ مرکز سعی و عمل کیا ہے؟ دو لفظوں میں "دین خالص" یا ایک لفظ میں "توحید" یعنی اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت اور کامل اطاعت، جو تنہا اسی کا حق ہے، اس کو اپنی ذات سے عمل میں لانا اور دوسروں میں اس کے لیے جد و جہد کرنا، ﴿أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ [سورۃ الزمر: ۳]، ﴿وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ [سورۃ البقرۃ: ۱۹۳]۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ [سورۃ الأنبیاء: ۲۵]

"اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اس کو یہی حکم بھیجا کہ میرے سوا کسی کی بندگی نہیں، پس میری ہی بندگی کرو۔"

﴿هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ [سورۃ الصف: ۹]

---

(۱) اخرجه البخاري في التاريخ الكبير، والترمذي في جامعه، حديث رقم: ۲۶۸۲

''وہ ہے جس نے اپنا رسولؐ رہنمائی اور سچے دین کے ساتھ بھیجا، تاکہ اس کو سب دینوں (تمام تصور کے نظام اطاعت) پر غالب کرے، اگرچہ شرک کرنے والوں کو ناگوار ہو۔''

دین حق کے لیے چند موانع

اس دین خالص کے لیے ہر زمانہ میں چند موانع اور مزاحم ہوتے ہیں، جن میں سے اکثر ان چار اقسام میں داخل ہیں:

شرک

١۔ شرک: یعنی غیر اللہ کو الٰہ بنالینا، اللہ کے سوا کسی ہستی کو مافوق الطبعی طور پر ضار اور نافع مان لینا، اس کو کائنات میں متصرف اور موثر تسلیم کرلینا۔

احتیاج والتجا (پناہ جوئی) اور خوف ورجا اس عقیدہ کے بالکل قدرتی اور طبعی نتائج و لوازم ہیں، اور دعا واستعانت اور خضوع (جو عبادت کی حقیقت ہے) اس کے لازمی مظاہر ہیں۔

شرک ایک مستقل دین اور ایک مکمل حکومت ہے، اس کا اور دین اللہ کا کسی ایک جسم یا دل و دماغ یا خطۂ زمین پر ایک ساتھ قائم ہونا ناممکن ہے، یہ غیر الٰہی دین جسم و نفس اور جسم و نفس سے خارج اتنی ہی جگہ گھیرتا ہے، جتنی دین اللہ کو کم سے کم درکار ہے۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ (سورۃ البقرۃ: ١٦٥)

''بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے برابر اوروں کو بناتے ہیں، ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی۔''

﴿تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ. اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.﴾ (سورۃ الشعراء: ٩٧-٩٨)

(مشرکین نے کہا:) خدا کی قسم ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے، جو تم کو (معبودوں کو)

کفر

۲۔ کفر یعنی اللہ کے دین اور اس کی شریعت کا انکار، یہ انکار اس کی حکومت سے بغاوت اور اس کے احکام سے سرتابی ہے، خواہ کسی طریقہ اور علامت سے ظاہر ہو۔

اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اللہ اور رسول کے احکام میں سے کسی حکم کو بھی یہ جان لینے کے بعد کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے نہیں مانتے، یا زبان سے تو انکار نہیں کرتے مگر جان بوجھ کر اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ایسے لوگ خواہ دوسرے احکام کے پابند ہوں اس دائرہ سے خارج نہیں۔ اللہ تعالیٰ یہودیوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ (سورۃ البقرۃ: ۸۵)

"کیا کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور دوسرے حصہ کو نہیں مانتے، تو اس کی کیا سزا ہے جو تم میں سے یہ کام کرتا ہے سوائے دنیا کی زندگی میں رسوائی کے، اور قیامت کے دن وہ پہنچائے جائیں سخت سے سخت عذاب میں، اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔"

صرف اللہ کی خداوندی اور حاکمیت کے اقرار سے طبعی طور پر خداوندی اور حاکمیت کے تمام دعویداروں کی خداوندی اور حاکمیت کا انکار ہو جاتا ہے، لیکن جو اشخاص خداوندان باطل کی خداوندی اور حاکمیت کا صاف صاف انکار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، یا دوسرے الفاظ میں انہوں نے اس قبلہ کی طرف منہ تو کر لیا ہے لیکن دوسرے قبلوں کی طرف ان سے پیٹھ بھی نہیں کی جاتی، دین الٰہی کے مقابلے میں دنیا میں جو نظام حاکمیت قائم اور شریعت الٰہی کے مقابلہ میں جو قوانین نافذ ہیں ان سے منحرف نہیں ہوا جاتا، وہ کبھی کبھی ان پر بھی عمل کر لیتے ہیں، اور بوقت ضرورت ان کی طرف رجوع کر لیتے ہیں، وہ درحقیقت اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔ ایمان باللہ کے لیے "کفر بالطاغوت" (۱) ضروری ہے، اور اللہ نے اس کو ایمان پر مقدم کیا ہے۔

---

(۱) طاغوت ہر وہ ہستی ہے جس کی خدا کے مقابلے میں اطاعت مطلق کی جائے۔۔۔۔ باقی اگلے صفحہ پر

﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ﴾

[سورۃ البقرۃ: ۲۵۶]

''جو سرکش کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا''۔

اس لیے قرآن نے ایسے اشخاص کا دعوائے ایمان تسلیم نہیں کیا جو غیر الٰہی قوانین، ان کے نمائندوں اور ان کے مرکزوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ان کو اپنا حَکَم اور ثالث بناتے ہیں:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ [سورۃ النساء: ۶۰] (۲)

''تم نے ان لوگوں کو نہ دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لائے جو آپ کی طرف اتارا گیا اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا، چاہتے ہیں کہ فیصلے کے لیے سرکش کی طرف، حالانکہ ان کو حکم ہو چکا ہے کہ اس کا انکار کریں، اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر دور لے جا ڈالے''۔

جاہلیت

اس کفر کی بو، ان اشخاص سے بھی نہیں نکلی جو مسلمانوں کے دائرے میں آ جانے کے بعد بھی ''جاہلیت'' سے منحرف اور عقائد و رسوم سے بے تعلق نہ ہو سکے، ان کے دلوں سے ابھی تک ان چیزوں کی نفرت اور کراہت نہیں گئی، اور ان کاموں کی تحقیر نہیں نکلی جن کو جاہلیت

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ''الطاغوت عبارۃ عن کل متعد و کل معبود من دون اللہ'' (معجم مفردات الفاظ القرآن للراغب الاصفہانی) طاغوت ہر شیطان ہے یا سلطان یا معمول انسان۔

(۲) یہ آیت حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق اس منافق کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اپنے ایک مقدمہ میں (جس کا دوسرا فریق ایک یہودی تھا) مشہور یہودی رئیس اور عالم کعب بن اشرف کو قاضی اور حَکَم بنایا تھا۔ (دیکھیے تفسیر روح المعانی علامہ آلوسی تفسیر سورہ نساء، آیت (۶۰)۔

صحابۂ کرام کی کیفیت یہی تھی، ان کو اپنے زمانۂ سابق (جاہلیت) سے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی، ان کے نزدیک "جاہلیت" سے بڑھ کر کوئی توہین نہ تھی، وہ جب اپنے اسلام لانے سے پہلے کے زمانے کا تذکرہ کرتے تو نہایت شرمندگی اور نفرت کے ساتھ، اس زمانہ کی تمام باتوں، اعمال و اخلاق اور کفر و فسق اور اللہ کی نافرمانی سے ان کو نہ صرف شرعی اور عقلی، بلکہ طبعی کراہت تھی، اللہ تعالیٰ ان کی یہ صفت اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ﴾ [سورۃ الحجرات: ۷]

"لیکن اللہ نے تمہارے دل میں ایمان کی محبت ڈال دی اور اس کو تمہارے دلوں میں، اور نفرت ڈال دی تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کی ہے۔"

جاہلیت کی ایک علامت یہ ہے کہ جب اللہ اور رسول کا کوئی حکم سنایا جائے تو قدیم رسم و رواج اور باپ دادا کے طور طریق کا نام لیا جائے اور اللہ و رسول کے مقابلہ میں گذشتہ زمانہ اور پرانے دستور کی سند پیش کی جائے:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ [سورۃ البقرۃ: ۱۷۰]

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی رستہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، اگرچہ ان کے باپ دادے نہ کچھ سمجھتے ہوں، اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ۔"

﴿بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ [سورۃ الزخرف: ۲۲]

"بلکہ کہتے ہیں کہ ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر اور ہم انہیں کے نقش قدم پر ٹھیک چل رہے ہیں۔"

اللہ کے حکم اور وحی کے مقابلہ میں اپنے باپ دادا کے عمل اور اپنی خواہش و مرضی کی پیروی کرنا خاص جاہلی رجحان ہے:

﴿قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ

غرض جاہلیت کی محبت یا اس کی اعانت جس لباس اور جس صورت میں جلوہ گر ہو، اور اس کی روح جس قالب میں بھی ظاہر ہو، وہ اس کو فوراً بھانپ لیتے ہیں، ان کو اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اور اس کی مخالفت کرنے میں کوئی مصلحت ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی، وہ جاہلیت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

ان کے زمانہ کے کوتاہ نظر یا رند مشرب و صلح کل، جو دیر و حرم، کعبہ و بت خانہ میں فرق کرنا ہی کفر سمجھتے ہیں، ان کی تضحیک کرتے ہیں اور تحقیر کے ساتھ ان کو فقیہ شہر، محتسب، واعظ تنگ نظر اور "خدائی فوجدار" کا لقب دیتے ہیں، لیکن وہ اپنا کام پورے اطمینان و استقلال کے ساتھ کرتے رہتے ہیں، اور کوئی شبہ نہیں کہ پیغمبروں کے دین کی حفاظت ہر زمانے میں انہیں لوگوں نے کی ہے، اور آج اسلام یہودیت و عیسائیت اور برہمنیت سے ممتاز شکل میں جو نظر آتا ہے، وہ انہیں کی ہمت و استقامت اور تفقہ کا نتیجہ ہے۔ جزاہم اللہ عن الاسلام و نبیہ خیر الجزاء۔ ان کو زبان حال و قال سے یہ کہنے کا حق ہے ؎

آغشتہ ایم ہر سر خارے بخون دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

بدعت

۳- بدعت: کسی ایسی چیز کو جس کو اللہ و رسولؐ نے دین میں شامل نہیں کیا ہے، اور اس کا حکم نہیں دیا، دین میں شامل کر لینا اور اس کا ایک جزو بنا دینا، اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کے لیے کرنا اور اس کی کسی خود ساختہ یا اصطلاحی شکل اور وضع کیے ہوئے شرائط و آداب کی اسی طرح پابندی کرنا جس طرح ایک شرعی حکم کی پابندی کی جاتی ہے، بدعت ہے۔

شرک و کفر (جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے) اگر مستقل دین ہیں تو بدعت مستقل شریعت ہے، اور شرک و کفر اگر اسلام کے مقابلہ میں خارج کی چیزیں ہیں، تو بدعت دین ہی کے اندر

شریعت انسانی کی تشکیل ہے جو اندر اندر نشوونما پاتی رہتی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات (اگر اس کو آزادی کے ساتھ نشوونما پانے کا موقع دیا جائے) اصل شریعت سے دو چند و سہ چند ہو جاتی ہے، اور رفتہ رفتہ شریعت الٰہی کی ساری جگہ اور انسان کے سارے وقت کو گھیر لیتی ہے، اس شریعت کی ذہنیت الگ ہے، اس کے فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات مستقل ہیں، اور بعض اوقات تعداد میں شریعت الٰہی کے احکام سے کہیں زیادہ۔

بدعت سب سے پہلے اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ تشریع (قانون سازی) اللہ کا حق ہے، کسی چیز کو قانونی حیثیت دینا، اس کی پابندی ضروری قرار دینا، یہ منصب صرف شارع (اللہ) کا ہے، انسانی قانون سازی اسی منصب الٰہی کے خلاف بغاوت ہے، اسی لیے قانون ساز انسان کو قرآن "طاغوت" کہتا ہے:

﴿يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ﴾ [سورة النساء: ٦٠]

"وہ چاہتے ہیں کہ اپنا مقدمہ ایک سرکش کے پاس لے جا کر فیصلہ کرائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ اس سے اعتقاد نہ رکھیں"۔

لیکن کسی چیز کو دین و شرع قرار دینا اور اس کو کسی خاص شکل اور شرائط کے ساتھ قربت خداوندی اور اجر و ثواب کا ذریعہ قرار دینا تو اس سے بھی بڑھ کر بات ہے، یہ تو شریعت سازی ہوئی، اور قرآن کہتا ہے کہ دین و شرع قرار دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ﴾ [سورة الشورى: ١٣]

"تمہارے لیے دین کی وہی راہ مقرر کی جس کا (حضرت) نوح کو حکم دیا تھا، اور ہم نے آپ کی طرف حکم بھیجا"۔

اہل عرب نے جب اپنی طرف سے تحلیل و تحریم کا کام شروع کیا اور مستقل احکام جاری کیے تو قرآن نے ان پر سخت جرح کی۔

﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ﴾ [سورة

[الشوریٰ: ۲۱]

"کیا ان کے کچھ شریک ہیں جنھوں نے ان کے لیے ایسا دین بنایا جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا ہے"

یہ اللہ کی اجازت کے بغیر دینی قانون سازی کیا تھی؟ اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

﴿وَقَالُوا هَٰذِهِ أَنْعَامٌ وَحَرْثٌ حِجْرٌ لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَن نَّشَاءُ بِزَعْمِهِمْ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا افْتِرَاءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيهِم بِمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ﴾ [سورۃ الانعام: ۱۳۸]

"اور انھوں نے کہا کہ یہ مویشی اور کھیتی ممنوع ہے، اس کو صرف وہی کھائیں گے جن کو ہم چاہیں، اپنے خیال کے مطابق، اور یہ مویشی ہیں جن کی پیٹھ پر چڑھنا منع ہے، اور کچھ مویشی جن کے ذبح پر اللہ کا نام نہیں لیتے، اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے۔ اللہ ان کے اس جھوٹ کی ان کو سزا دے گا۔"

﴿وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا وَإِن يَكُن مَّيْتَةً فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ﴾ [سورۃ الانعام: ۱۳۹]

"اور انھوں نے کہا کہ ان مویشیوں کے جو بچے پیٹ میں ہیں وہ ہمارے مردوں ہی کے کھانے کے لیے مخصوص ہیں اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہیں، اور اگر مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔ اللہ ان کو ان کی باتیں بنانے کی سزا دے گا، وہ حکمت والا اور خبردار ہے۔"

عرب کے ان شریعت سازوں کا یہ جرم جس کو قرآن "افترا" کہتا ہے، کیا تھا؟ یہی کہ انھوں نے بلا کسی آسمانی سند اور دلیل کے محض اپنے اتفاقِ رائے اور اصطلاح سے ایک چیز کو ایک کے لیے حلال اور دوسرے کے لیے حرام کر دیا، اور اس کے ایسے قواعد و احکام اور اصول بنوا یا مقرر کیے جن کا کوئی آسمانی ماخذ نہ تھا، اور پھر ان کی ایسی پابندی کی اور دوسروں سے کرائی جیسی پیغمبروں کی شریعتوں اور احکامِ الٰہی کی ہوتی ہے کہ اگر کوئی اس کے خلاف کرے تو سخت گنہگار سمجھا جائے اور ظالم اور مطعون ہو۔

انسان کے مختلف و متفاوت حالات کا پورا علم ہے، اس کے ساتھ وہ رؤوف و رحیم (بے حد مہربان و شفیق) بھی ہے، اس علم محیط اور شفقت بے پایاں کی بنا پر اس نے انسانوں کے لیے اپنے پیغمبروں کے ذریعے نہایت آسان شریعت نازل کی، اور اس شریعت میں ان کی کمزوریوں، مشکلات اور کوتاہیوں کا پورا لحاظ رکھا، اور ان کی قوت، وقت اور وسعت اور زمان و مکان کا پورا لحاظ کرتے ہوئے ان کے لیے ایک عالم گیر اور ابدی قانون مقرر فرمایا، اس کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [سورۃ البقرۃ: ۲۸۶]

"اللہ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مجبور نہیں کرتا"۔

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ [سورۃ النساء: ۲۸]

"اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے بوجھ کو ہلکا کرے، اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے"۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [سورۃ الحج: ۷۸]

"تم پر اللہ نے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی"۔

رسول اللہ (ﷺ) کے متعلق فرمایا

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ [سورۃ التوبۃ: ۱۲۸]

"تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آیا جس پر تمہاری تکلیف شاق ہے تمہاری اس کو بڑی فکر ہے، ایمان والوں پر نہایت شفیق و مہربان ہے"۔

رسول اللہ (ﷺ) نے اپنی شریعت کے متعلق فرمایا

"بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ السَّمْحَةِ" (۱)

"مجھے نہایت سیدھے سادے آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا"۔

"اِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ" (۲)

"بے شک یہ دین آسان ہے"۔

---

[۱] رواہ احمد فی مسندہ عن ابی امامۃ الباہلی، حدیث رقم: ۲۲۶۴۷

[۲] رواہ النسائی فی سننہ الکبریٰ، کتاب الایمان و شرائعہ، الدین یسر، حدیث رقم: ۱۱۷۰۵

امت کی مشقت کا آپ کو اتنا خیال تھا کہ فرمایا:

"لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ." (۱)

"اگر مجھے اپنی امت کی تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنا فرض قرار دے دیتا۔"

لیکن دین کی یہ سہولت اور خدا کی طرف سے اس بات کی ضمانت اسی وقت تک ہے جب تک کہ اللہ شارع ہے اور شریعت اسی کی ہے۔ لیکن جب انسان شارع بن جائے اور وہ شریعت الٰہی میں مداخلت اور اضافہ شروع کر دے، تو پھر دین کی سہولت باقی نہیں رہ سکتی، نہ انسان کا علم محیط ہے، نہ وہ مختلف انسانوں کی ضروریات، مصالح اور زمان و مکان کے اختلافات کا لحاظ رکھ سکتا ہے، نہ اس کو اپنے بنی نوع پر وہ شفقت ہو سکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو دین خالص ہونے کی صورت میں ہر ایک کے لیے قابل عمل اور بالکل سہل ہوتا ہے، وہ ان بدعات کی آمیزشوں اور وقتاً فوقتاً اضافوں کے بعد اس قدر دشوار، پیچیدہ اور طویل ہو جاتا ہے کہ اس پر پورے طور پر عمل کرنا رفتہ رفتہ ناممکن ہوتا چلا جاتا ہے، لوگوں کو گریز اور حیلہ جوئیوں کی عادت پڑ جاتی ہے، اور بہت سے لوگ ایسے مذہب کا قلادہ اپنی گردن سے اتار دیتے ہیں، مذاہب کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترک مذہب کی کثرت، لو برت اور الحاد و لا مذہبیت کا آغاز عموماً انہیں لاتعداد بدعات کے بعد ہوا، جن کی پابندی ایک متوسط درجہ کے انسان کے لیے تقریباً ناممکن ہو گئی تھی، اور آدمی ان کا پابند رہ کر کسی اور کام کا نہیں رہ سکتا تھا، قرون وسطیٰ میں بھی علم و عقل کی بغاوت کلیسا کے اسی مذہبی نظام کے خلاف تھی جس سے اصل مسیحی مذہب کو اتنی نسبت بھی نہ تھی۔

یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ الٰہی دین و شریعت کی ایک خصوصیت ان کی عالمگیر یکسانی ہے، یہ یکسانی زمانوں کے لحاظ سے بھی ہے اور مکانوں کے لحاظ سے بھی، اللہ چونکہ "رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ" ہے، وہ زمان و مکان کے حدود و قیود سے بالاتر ہے، اس لیے اس کی شریعت میں کامل یکسانی پائی جاتی ہے، اس کی آخری شریعت جس کی تکمیل آخری پیغمبر محمد رسول اللہ

(۱) رواہ أبو داؤد في سننه، كتاب الطهارة، باب السواك، حديث رقم: ۴۷

(ﷺ) پر ہو چکی ہے۔ آپ کی طرح سب کے لیے یکساں اور زمین و آسمان کی طرح سب کے لیے یکساں ہے۔ اسی طرح جو قرآن اول میں تھی، وہی شکل چودھویں صدی ہجری میں بھی ہے۔ وہ جیسی اہل مشرق والوں کے لیے ہے، ویسی ہی اور وہی کی وہی مغرب والوں کے لیے بھی۔ جو قواعد و احکام عبادت کے، جو اخلاق اور تقرب الی اللہ کی جو تعلیمات اہل عرب کے لیے تھیں وہی اہل ہندوستان کے لیے بھی ہیں۔ اگر دنیا کے کسی حصہ کا کوئی مسلمان یا باشندہ دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں چلا جائے تو اس کو فرائض اسلام کے ادا کرنے میں اور مسجد میں عبادت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی، اور اس کے لیے کسی مقامی ہدایت نامہ اور رہبری کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کو اپنی جگہ سے کوئی اجنبیت اور مسافرت محسوس نہیں ہوگی، بلکہ وہ مقتدی ہونے کے بجائے اگر صاحب علم ہے تو بے تکلف امام بن سکتا ہے اور فتویٰ دے سکتا ہے۔

بدعات یکساں نہیں ہوتیں

لیکن بدعات کا یہ حال نہیں، ان میں یکسانی اور وحدت نہیں ہوتی، ان میں زمان و مکان کا بڑا دخل ہے، وہ ہر ملک کے مقامی رسم و رواج یا شہری کلچر سے داخل کی گئی ہیں، اور خاص تاریخی و مقامی اسباب و حالات میں بنی ہیں، ان کو تمام عالم اسلامی میں رواج نہیں دیا جا سکتا، نہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو ان کا علم ہونا ضروری ہے، معلوم ہونے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ وہ سب ان کو قبول کر لیں، اس لیے ہندوستان کی بدعات مصر کی بدعات سے مختلف ہیں، اور ایران و شام کی بدعات میں کوئی اشتراک نہیں، ملکوں سے گزر کر بعض اوقات شہر شہر کی بدعات مختلف ہوتی ہیں، ایک شہر کے مسلمانوں کو دوسرے شہر کی مخصوص بدعات کا علم نہیں ہوتا، یہ بات بڑھتے بڑھتے محلوں اور گھروں تک پہنچ سکتی ہے، ہر گھر کا دین مختلف ہو سکتا ہے۔

رسول اللہ (ﷺ) کے سامنے تمام دوسری شریعتوں اور مذاہب کا عبرتناک انجام تھا، یہودیت اور عیسائیت مسخ شدہ اور محرف شکل میں موجود تھیں۔ اس لیے آپ نے شریعت اسلامی کو اپنی حقیقی شکل اور اصلی مقدار میں رکھنے کی پوری کوشش فرمائی اور اس کے لیے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کیں، آپ نے اپنے ماننے والوں کو بدعت سے بچنے اور سنت کی حفاظت کی

بڑی تاکید سے تلقین کی، آپ نے فرمایا:

"مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ" (۱)

"جو ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرے جو اس میں داخل نہیں تھی تو وہ بات مسترد ہے۔"

"شَرُّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ، وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ، وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ" (۲)

"بدترین بات (دین میں) نئی باتیں ایجاد کرنا ہے، اور (دین میں) ہر نئی ایجاد کردہ چیز بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی جہنم میں ہوگی۔"

اور یہ حکیمانہ پیش گوئی بھی فرمائی۔

"مَا أَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً إِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ" (۳)

"جب کچھ لوگ دین میں کوئی نئی بات پیدا کرتے ہیں تو اس کے بقدر کوئی سنت اٹھ جاتی ہے۔"

صحابہ کا طرز عمل

آپ کے براہ راست جانشین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس وصیت کی پوری تعمیل کی اور بدعات کے بارے میں کسی قسم کی رواداری اور کمزوری روا نہیں رکھی، ان کے انکار بدعات کے واقعات ملاحظہ ہوں، اگر کوئی شخص بدعات کے حقیقی مفاسد اور مخالفت شریعت کی حکمت و اسرار سے واقف نہ ہو تو ان کو تشدد اور غلو پر محمول کرے گا، لیکن اگر کوئی شخص مذاہب کی تاریخ

(۱) رواہ البخاری فی [illegible] ومسلم فی [illegible] حدیث رقم [illegible]

(۲) رواہ مسلم فی [illegible] حدیث رقم [illegible]

(۳) اخرجہ احمد فی مسندہ [illegible] اس فرمان نبوی کی اگر شرح دیکھنا ہو تو مکتوبات امام ربانی (مکتوب ۱۸۶ بخواجہ عبد الرحمٰن ص ۴۹۱، ج ۱، ۸۰) اور کی وہ [illegible] ملاحظہ ہو، اللہ زندگی میں واضح ہو یا ان لوگوں کی عملی زندگی میں جو بدعات میں مبتلا ہیں۔

ہیں، اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔“

نتیجۃً وعملاً ایسے غفلت شعار اور آخرت فراموش، منکرین آخرت اور اللہ و رسولؐ سے بغاوت کرنے والوں سے متاثر نہیں ہوتے، پیغمبروں کی دعوت کے لیے ان کا وجود بھی اسی قدر بے سود اور بعض اوقات سنگ راہ ہوتا ہے جس طرح کفر میں منکرین کا، اور بعض اوقات یہ مدعیان اسلام، اسلام کے خلاف حجت اور تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، پھر اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہوتی ہے کہ یہ غافلین یا منافقین اپنی کثرت یا دنیاوی لیاقت یا کوششوں یا محض وراثت سے مسلمانوں کی مسند حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں، اور مسلمانوں کی امامت ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے، یہ مسلمانوں کی زندگی میں اتنا رسوخ و اثر پیدا کر لیتے ہیں کہ ان کے اخلاق و اعمال عوام کے لیے نمونہ بن جاتے ہیں، اور ان کی عظمت اور ہیبت دل و دماغ میں جاگزیں ہو ہوتی ہے، اس وقت ان ”اکابر مجرمین“ کی وجہ سے غفلت و خدا فراموشی اور غیر اسلامی زندگی کا ایسا دور دورہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی عملداری میں ”جاہلیت“ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات جب اس طرز زندگی کو کچھ زیادہ مدت گزر جاتی ہے تو اسی کا نام ”اسلامی تہذیب و تمدن“ پڑ جاتا ہے، جس کی مخالفت ”غیر اسلامی تمدن“ سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

علمائے حق کی ذمہ داریاں و فرائض

ان تمام حالات میں پیغمبروں کے جانشینوں کو کام کرنا پڑتا ہے، شاید انسانوں کی کوئی جماعت اتنی سخت قول اور فرائض و ذمہ داریوں سے اتنی گراں بار نہیں جتنی نائبان رسولؐ اور علماء و مصلحین اسلام کی جماعت ہے، جسمانی امراض کے طبیبوں کو بھی کبھی آرام اور فرصت کا موقع میسر آجاتا ہوگا، لیکن ان اطباء روح کے لیے کوئی موسم اعتدال اور صحت کا نہیں، بہت سی جماعتیں ایسی ہیں کہ جب ان کی دینی حکومت قائم ہو جاتی ہے تو ان کی جدوجہد ختم ہو جاتی ہے اور ان کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے لیکن علمائے حق اور ﴿قوامین للہ شہداء بالقسط﴾ (سورۃ المائدۃ ۵:۸) (اللہ کی طرف سے قیام اور انصاف کے گواہ) کی جماعت کا

کام بعض مرتبہ مسلمانوں کی حکومت میں ختم ہونے کے بجائے کچھ بڑھ ہی جاتا ہے، کچھ چیزیں ہیں جو حکومت وخلافت اور دولت وفراغت ہی کے زمانے میں پیدا ہوتی ہیں، اور علمائے اسلام ہی کا فرض ہوتا ہے کہ ان کی نگرانی کریں، وہ اپنے فریضۂ احتساب، نگرانی، اخلاق اور دینی رہنمائی کے منصب سے سبکدوش نہیں ہوتے، اس وقت بھی ان کا جہاد اور اس کی جدوجہد جاری رہتی ہے، کہیں مسلمانوں کی اسرافانہ زندگی پر روک ٹوک کر رہے ہیں، کہیں سامانِ عیش وغفلت پر ان کی طرف سے قدغن ہے، کہیں چوری کی شراب کو گرفتار کیا ہے اور اس کو انڈیل رہے ہیں، کہیں باجوں اور موسیقی کے آلات کو توڑ رہے ہیں، کہیں مردوں کے لیے ریشم کے لباس اور سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال پر چیں بجبیں ہیں، کہیں بے حجابی اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط پر معترض ہیں، کہیں حاسدوں کی بے قاعدگیوں اور بداخلاقیوں کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں، کہیں اپنے زمانہ کے خلافِ اخلاق اور خلافِ شرع باتوں اور بدعتوں کے خلاف وعظ کہہ رہے ہیں، کہیں غیر مسلموں اور عجمیوں کے عادات وخصوصیات اختیار کرنے پر ان کی طرف سے مخالفت ہے، کبھی مسجدوں کے صحن اور مدرسوں کے ایوانوں میں حدیث کا درس دے رہے ہیں، اور قَالَ اللّٰہُ اور قَالَ الرَّسُوْلُ کی صدا بلند کر رہے ہیں، کبھی خانقاہوں میں یا اپنے گھروں اور مسجدوں میں بیٹھے ہوئے دلوں کا زنگ دور کر رہے ہیں، اللہ کی محبت وطاعت کا شوق پیدا کر رہے ہیں، امراضِ قلب، حسد، تکبر، حرص دنیا اور دوسرے نفسانی اور روحانی امراض کا علاج کر رہے ہیں، کبھی منبر پر کھڑے ہوئے جہاد کا شوق دلا رہے ہیں، اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت یا اسلامی فتوحات کے لیے آمادہ کر رہے ہیں، پوری اسلامی تاریخ میں آپ کو زندہ اور ربانی علماء جو حکومت وقت کے دامن سے وابستہ نہیں تھے، یا حقیر جھگڑوں میں مشغول نہیں تھے، انہیں مشاغل میں منہمک نظر آئیں گے، اور مسلمانوں کا کوئی دورِ حکومت ان علمائے حق اور ان کی جدوجہد سے خالی نہیں رہا۔

حضرت حسن بصریؒ کی مجلسِ وعظ

بنی امیہ کا دور مسلمانوں کا شاہانہ عہد ہے، بظاہر مسلمانوں کو تمام کاموں سے فرصت

ہو گئی ہے، مگر علماء کو فرصت نہیں، حضرت حسن بصریؒ کی مجلس وعظ گرم ہے، جس میں اپنے
زمانہ کے منکرات و بدعات کے خلاف تقریر ہو رہی ہے، اپنے زمانہ کی معاشرت، نظام اور
اہل حکومت کی بے دینی پر تنقید ہے، نفاق کی علامات و منافقین کے اوصاف و نتائج بیان
ہو رہے ہیں، اور موجودہ زندگی پر ان کو منطبق کیا جا رہا ہے، خشیت الٰہی اور آخرت کا بیان
ہے جس سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ہے، لوگ رو رہے ہیں، حاضرین کی ہچکیاں بندھ گئی
ہیں، سورۂ فرقان کے آخری رکوع کی [illegible]
[illegible] کی تفسیر ہو رہی ہے،[1] [illegible]
اور واقعات اس طرح بیان کیے جا رہے ہیں کہ [illegible] کی تصویر کھینچ دی ہے [illegible]
چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں، لوگ مجلس سے توبہ کر کے اٹھتے ہیں، اور سیکڑوں آدمیوں کی
اصلاح حال ہو رہی ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا اعلان حق

بنی عباس کا دور ہے اور امام احمد بن حنبلؒ شاہ وقت کے ذوق و رجحان اور مسلک کے
خلاف مذہب معتزلہ کی صاف صاف تردید کر رہے ہیں، اور بدعات کا رد اور سنت کا اعلان
کرتے ہیں، حکومت کے ظلم اور تشدد کو برداشت کرتے ہوئے رجحان کے مقابلہ میں خالص سنت اور عقائد
سلف کی تبلیغ فرما رہے ہیں، اور یہ سب اس جرأت اور استقامت کے ساتھ کہ گویا مامون و معتصم
کی حکومت نہیں ہے، بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت ہے۔

علامہ ابن الجوزیؒ کے مواعظ

بغداد اپنے عروج پر اور بغداد کی تہذیب، دولت و ثروت، فارغ البالی اور آزادی عروج پر ہے،
ہر طرف عیش و تنعمات کا دور دورہ ہے، تاریخ رسالہ کے صفحوں میں اور [illegible] کے
سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، بازار میں بڑی چہل پہل ہے، لیکن سیکڑوں آدمی ان تمام

(۱) کتاب قوت القلوب [illegible]

دلچسپیوں اور تفریحات سے آنکھ بند کیے ایک طرف چلے جا رہے ہیں، آج جمعہ کا دن ہے، محدث ابن جوزی کا وعظ ہو رہا ہے، سینکڑوں آدمی تائب اور بیسیوں غیر مسلم مسلمان ہو رہے ہیں، لوگ خلاف شرع امور سے توبہ کر رہے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا روحانی فیض

ایک طرف یہ پرشور اور ہنگامہ خیز بغداد میں نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا درس و وعظ اور روحانی فیض جاری ہے، جس سے عرب و عجم کے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، بڑے بڑے امراء اور شہزادے اپنے عیش و دولت کو خیر باد کہہ کر زہد و فقر کی زندگی اختیار کرتے ہیں، بڑے بڑے سرکش اور فتنہ پرداز ان کی مجلس میں تائب ہوتے ہیں، خلافت عباسیہ کے اسی دور انحطاط میں اور خلیفۂ بغداد کی حکومت کے بالکل مقابل اس درویش کی روحانی اور دینی حکومت قائم ہے، جس کا سکہ عرب و عجم پر رواں ہے۔

دیگر مساعی اور کوششیں

بعد کے تمام عہدوں میں اور حکومت اسلامی کے تمام اطراف و اکناف میں، سلاطین و امراء کے بالمقابل اور ان کی دوسری دلچسپیوں، دعوتوں اور تحریکوں اور مشاغل کے ساتھ علمائے حق کی یہ کوششیں اور ان کے مرکز، مساجد، مدارس، خانقاہیں، مجالس وعظ اور باضابطہ بے ضابطہ احتساب جاری رہا۔(1)

علمائے حق کا صبر و عزیمت اور ثبات و استقامت

علمائے حق کا یہی بدقسمت یا خوش قسمت گروہ ہے جس کو مسلمان بادشاہوں اور ان کے کارکنان حکومت کے ہاتھوں (جیسے کہ دوسروں کو بیم و زر کی تحریصیں اور عہدوں کے پروانے

(1) ہندوستان کے متعلق اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے حضرت والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحئی کی عظیم الشان عربی تصنیف نزہۃ الخواطر کی آٹھ جلدوں میں سے کوئی جو ہندوستان کے مسلمان مشاہیر، اعیان اور علماء کی سب سے بڑی تاریخ ہے۔

ملتے تھے) دار ورسن اور تازیانے کے انعامات ملے۔ اسی گروہ کے کتنے افراد کو ایک مسلمان حاکم (حجاج) کے ہاتھوں شہادت کا سرخ خلعت ملا، پھر اسی گروہ کے ایک مقتدر فرد (حضرت امام ابو حنیفہؒ) کو امیر المؤمنین منصور عباسی کے ہاتھوں زہر کا جام نوش کرنا پڑا، پھر اسی گروہ کے دوسرے امام (حضرت امام احمد بن حنبلؒ) کو سب سے بڑے روشن خیال مسلمان بادشاہ (مامون) کے زمانہ میں پابجولاں اور اسیر زنداں ہونا پڑا اور اس کے جانشین (معتصم) کے ہاتھوں تازیانے کھانے پڑے۔

آخر زمانے میں بھی کیسے کیسے عادل و دادگر مسلمان فرمانرواؤں کے ہاتھوں کیسے کیسے جلیل القدر علماء پر بیداد ہوئی، جہانگیر کی زنجیر عدل مشہور ہے، مگر حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے پاؤں میں بھی زنجیر پڑی اور ان کو اپنے اظہار حق کے صلہ میں گوالیار کے قلعہ میں محبوس ہونا پڑا۔

دعوت و جہاد

ان کارناموں اور خدمات کے علاوہ (جو حاملین دین اور محافظین شریعت کے فرض منصبی ہیں) جن کو ہم اس حیثیت سے دفاعی کہہ سکتے ہیں کہ وہ شرک و کفر، بدعت اور غفلت کے مقابلہ میں اسلام کی حفاظت کی کوششیں ہیں، مگر یہ درحقیقت اسلام کی مستقل دعوت و تبلیغ اور دین کی مسلسل جدوجہد ہے جو قیامت تک جاری رہے گی۔

"لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ." (۱)

"میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر علانیہ قائم رہے گا، کسی کے مدد نہ کرنے سے اس کو کچھ نقصان نہ پہنچے گا"

"اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ إِلَى أَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ أُمَّتِي الدَّجَّالَ، لَا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَلَا عَدْلُ عَادِلٍ." (۲)

(۱) رواہ مسلم، حدیث رقم: ۱۹۲۰

(۲) رواہ ابو یعلی الموصلی فی مسندہ عن انس بن مالک، رقم: ۴۲۹۶) و الدیلمی ۲/۱۲۲، رقم: ۲۶۳۹)۔

"جہاد اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا، اور میرے آخری امتی کے دجال سے جنگ کرنے تک جاری رہے گا۔ اسے نہ کسی ظالم کا ظلم ختم کرے گا اور نہ ہی کسی عادل کا عدل۔"

ارتداد اور اس کا مقابلہ

لیکن دین کے علاوہ دو اور شعبے ہیں جو ہر زمانے کے علماء کے ذمہ ہیں اور علمائے ربانی ان کو انجام دیتے رہے ہیں

۱۔ اسلامی فتوحات سے عموماً اور مبلغین مسیحی، صوفیہ اور بعض مسلمانوں کے اخلاق اور محبت کے اثر سے بیشتر مسلمانوں کے مفتوحہ ممالک میں لاکھوں آدمیوں نے اسلام قبول کیا، اور پوری پوری برادریاں اور بڑے بڑے خاندان اسلام میں داخل ہو گئے، لیکن ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا جا سکا، ذہن پر اسلام کی تعلیمات کا کوئی اثر نہ پڑ سکا، یا اگر ان پر کوئی اثر پڑا تو ان کی بعد کی نسلوں میں یہ اثر باقی نہ رہ سکا، اور رفتہ رفتہ اس کے سوا ان کو کچھ یاد نہ رہا کہ ہمارے باپ دادا مسلمان تھے، اور انہوں نے کسی زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا، اور سوائے اسلامی نام اور کلمہ طیبہ کے الفاظ کے ان کے پاس اسلام کا کوئی نشان باقی نہ رہا، کچھ نسلوں کے بعد یہ نوبت آگئی کہ اسلامی نام بھی باقی نہ رہے، اور کلمہ طیبہ بھی سیکڑوں میں سے چند کے سوا کسی کو یاد نہ رہا، گویا صرف نام کے مسلمان رہ گئے، پھر نام کا اختلاف باقی رہا، پھر وہ بھی مٹنے لگے، اور اس وقت باقاعدہ ان کا ارتداد عمل میں آنے لگا۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں خاص حصے کے باہر اسلام کی تبلیغ ہمیشہ کمزور رہی، اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، تقریباً ہر بڑے شہر سے فاصلہ پر اور ہندوستان کے تمام اطراف میں لاکھوں کی تعداد میں ایسی مسلمان قومیں اور برادریاں موجود ہیں جن کا اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہا، دیہاتوں کی بڑی مسلمان آبادی ایسی ہے جو نئے سرے سے تبلیغ اسلام کی محتاج ہے، ان میں سے بکثرت ایسے "مسلمان" ہیں جو خود عہد جاہلیت میں ہیں، اور ان کو بعثت نبوی کی خبر نہیں، وہ اسلام سے اتنے بے خبر ہیں جتنے دیہاتوں کے غیر مسلم، فرائض و احکام

اسلام کا ذکر چھوڑ کر لکھنؤ بڑے شہروں کے اطراف و نواح میں ایسے مسلمان ملتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام نامی سے بھی واقف نہیں۔

بعض علمائے ربانی نے اپنے زمانہ میں ان علاقوں اور دیہاتی رقبوں کی طرف توجہ کی، اور بعض نو مسلمان قوموں اور برادریوں کو از سر نو مسلمان بنایا۔ ان میں تبلیغی دورے کیے، وعظ و نصیحت، اختلاط، آمد و رفت اور اپنے اخلاق و تالیف قلب سے ان کے دل مٹھی میں لیے۔ ان کو مرید کر کے ان کو توحید اور اتباع سنت کے راستہ پر لگایا، شرک و بدعت سے تائب کیا، جاہلانہ رسمیں، غیر مسلموں کی وضع و صورت اور کفر و جاہلیت کے شعار چھڑائے، ان میں اخلاق و انسانیت پیدا کی، پابند فرائض اور خوش اوقات بنایا، علم کا شوق دلایا اور تعلیم کو رائج کیا۔ اور ان میں سے لائق افراد کو چھانٹ کر اور اپنے پاس رکھ کر ان کی تربیت و تعلیم کی، پھر ان سے اپنی قوم اور دوسری جماعتوں کی تبلیغ و اصلاح کا کام لیا، یہ تبلیغی کام جو انبیاء (علیہم الصلاۃ والسلام) کے طریق کار سے سب سے زیادہ ظاہری مشابہت رکھتا ہے، ان کے دوسرے کارناموں کے مقابلہ میں کسی طرح کم اہم نہیں۔

دعوت الی اللہ اور اشاعت علم دین کی خدمت

۴- قرآن و حدیث اسلام کی طاقت کا اصلی سرچشمہ ہیں، جن سے ہمیشہ طاقت اور روشنی حاصل کی جا سکتی ہے، اور جن کے ذریعہ سے ہر زمانہ میں مسلمانوں کے کمزور سے کمزور ڈھانچہ میں روح پھونکی جا سکتی ہے، شرک و کفر، بدعت و غفلت کے خلاف سب سے کارگر حربہ قرآن و حدیث کا علم اور ان کی اشاعت ہے۔ ان کا صحیح علم اور ان کی روشنی جس قدر پھیلتی جائے گی، کفر و جہالت کی تاریکیاں دور ہوتی جائیں گی۔ اس لیے ہر دور تبلیغوں کی ایک تبلیغ ان کی نشر و اشاعت ہے۔

انبیائے کرام کی بڑی خصوصیت ان کی ہم آہنگی اور یک آہنگی ہے، یعنی وہ سب ایک بات کہتے ہیں اور ایک ہی بات کہتے رہتے ہیں۔ وہ کیا؟

﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ﴾ [سورۃ ھود: ۵۰]

علمائے دین کا منصب

استقامت اور حقیقت پسندی کا جامع

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

﴿یٰأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُونُوا قَوَّامِینَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ﴾ [سورۃ المائدۃ: ۸]

"اے ایمان والو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی"

حضرات! علمائے کرام کی اس موقر مجلس میں کچھ عرض کرنا بڑی ذمہ داری کی بات ہے، پرانا حکیمانہ مقولہ ہے "لکل مقام مقال" میں کوشش کروں گا کہ اس اہم اور باوقار مجلس اور موقع محل کے مطابق اپنے معروضات و خیالات پیش کروں۔

قبلہ نما استقامت کی ضرورت

لوگوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالے ہیں، اس میں شیخ سعدی خاص طور پر بڑے ممتاز ہیں، اسی طریقہ سے مولانا روم مثالوں کے بادشاہ ہیں، وہ بھی روزمرہ کے واقعات سے بڑی حکیمانہ، گہرے اور بڑے عمیق نتائج نکالتے ہیں، میں اپنا بھی اسی قسم کا ایک تجربہ اور عبرت کا سبق پیش کرتا ہوں، آپ کو معلوم ہے کہ میں ایک طویل سفر کر کے آرہا ہوں، دہلی سے چلا اور حیدرآباد پہنچا، خدا جانے گاڑی نے کیا کیا رخ بدلے، کن کن علاقوں سے گزری، لیکن قبلہ نما نے ہمیشہ صحیح قبلہ بتایا، اس نے نہ گاڑی کے چکر کھانے کی پرواہ کی، نہ سمت کے تبدیل ہونے کی، مجھے بڑا رشک آیا کہ ایک ادنیٰ سی جماداتی چیز جو انسان کی صنعت ہے، وہ اتنی امین، اتنی ثابت قدم، اتنی خوددار اور

خدائی فوجدار

ہماری زبان اور محاورہ میں ''خدائی فوجدار'' ایک طنز کا لفظ ہے کہ آپ خدائی فوجدار ہیں؟ لیکن ''قوامین للہ'' کا مفہوم تقریباً خدائی فوجداری کا ہے، مبالغہ کے اس صیغہ (قوامین) سے ''خدائی فوجدار'' ہی کی شان ظاہر ہوتی ہے، اگر ''قائمین للہ'' ہوتا تو شاید یہ بات نہ پیدا ہوتی، کوئی پوچھے نہ پوچھے، کوئی بلائے نہ بلائے، کوئی کہے نہ کہے، آپ اپنا فرض ادا کررہے ہیں، آپ ہر جگہ پہنچ رہے ہیں، اس آیت میں خطاب اگرچہ پوری امت کو ہے، لیکن علماء کی اس بارے میں امتیازی شان ہونی چاہیے، ان کو ﴿شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ﴾ حق وصداقت کا گواہ وعلم بردار ہونا چاہیے، اگر امت اسلامیہ کا فرض اقوام عالم کا احتساب ہے، تو علمائے اسلام کا فرض مسلم معاشرہ کا احتساب کرتے رہنا ہے، کہ کہاں سے یہ معاشرہ صراط مستقیم سے ہٹ رہا ہے، کہاں سے اس نے خط مستقیم کو چھوڑا ہے، اس بارے میں ان کا کام بالکل بیرومیٹر کا سا ہے، وہ ہر جگہ، ہر موسم میں ہوا کا دباؤ بتاتا ہے، وہ صحیح شہادت ادا کرتا ہے۔

حضرات! اسی طرح علماء کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو زندگی کے حقائق، ملک کے حالات، ماحول کے تغیرات اور تقاضوں سے باخبر اور روشناس رکھیں، ان کی کوشش رہنی چاہیے کہ مسلم معاشرہ کا رابطہ زندگی اور ماحول سے کٹنے نہ پائے، اس لیے کہ اگر دین اور مسلمانوں کا رابطہ زندگی سے کٹ گیا اور وہ خیالی دنیا میں زندگی گزارنے لگے، تو پھر دین کی آواز بے اثر ہوگی، اور وہ دعوت واصلاح کا فرض انجام نہیں دے سکیں گے، اور اتنا ہی نہیں ہوگا، بلکہ اس دین کے حاملین کو اس ملک میں رہنا مشکل ہو جائے گا، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں علماء نے سب کچھ کیا، لیکن زندگی کے حقائق سے امت کو روشناس نہیں کیا، اس ماحول میں اپنے فرائض کے انجام دینے کی انہوں نے تلقین نہیں کی، ایک اچھا شہری، ایک مفید عنصر بننے، اور اس ملک کی قیادت حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں اس ملک نے ان کو اس طرح اگل دیا جیسے لقمہ اگلا جاتا ہے، اور ان کو اگل کر کے باہر پھینک دیا، اس لیے کہ انہوں نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی، آج ہندوستان کے مسلمان ایک دانشمندانہ اور

دعوت کے ساتھ رہیں، آپ اپنی تہذیبی و معاشرتی خصوصیات کے ساتھ رہیں، آپ اپنے ملی تشخص کو پورے طور پر برقرار رکھیں، اور اس کے کسی حصہ سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوں، لیکن زندگی کے دھارے سے الگ نہ ہوں، میں قومی دھارے کو نہیں کہتا (خدا نہ کرے کہ اس زندگی میں کبھی میری زبان سے یہ لفظ نکلے کہ قومی دھارے میں جذب ہو جایئے) نہیں، زندگی کے دھارے سے آپ الگ نہ ہوں، اس لیے کہ زندگی کے دھارے سے جو الگ ہوا وہ الگ ہی ہو گیا، اس کی جگہ زندہ انسانوں میں نہیں رہتی۔

میں اسلام کو ایسا محدود اور ناقص نہیں سمجھتا کہ اگر جائز ت اور زندگی کے مسائل کی طرف توجہ کی جائے تو فرائض چھوٹ جائیں گے، عقائد میں خلل آ جائے گا، ہمارے اسلاف نے شہنشاہی کی اور امپائر بنائے ہیں، لیکن ان کی تہجد بھی نہیں چھوٹی، معمولی سنت بھی ترک نہیں ہوئی۔

حضرت سلمان فارسیؓ کا واقعہ ہے، عراق کے گورنر تھے اور مدائن کے دارالحکومت میں رہتے تھے، ایک مرتبہ کھانے کی کوئی چیز زمین پر گر گئی تو اٹھا کر صاف کر کے کھانے لگے، کسی نے کہا کہ ارے آپ والی ہو کر ایسا کام کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ کیا میں اپنے حبیب کی سنت تم جیسے بیوقوف کی خاطر چھوڑ دوں گا؟ یہ نہیں کہ آگ آئے تو پانی نہیں رہے گا، اور پانی آئے تو آگ بجھ جائے گی، یہ غلط تخیل ہے، آپ پوری عزیمت، شانِ تقویٰ اور کثرتِ عبادت کے ساتھ اچھے اور کامیاب شہری بن سکتے ہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہی اچھا شہری بن سکتا ہے جو خدا کا سچا پرستار اور اپنے اصولوں کا پابند ہو۔

آج ہندوستان ہی نہیں تقریباً تمام مسلم ممالک اور عرب ممالک کی بھی حالت یہ ہے کہ وہاں بھی یورپ، امریکہ کے گرم جھونکے آ رہے ہیں، نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے ہیں، اسلام اور جاہلیت کی کشمکش برپا ہے، وقت کے نئے نئے تقاضے اور زندگی کے نئے نئے مسائل درپیش ہیں، ان سے آنکھیں بند کر لینا اور یہ کہنا کہ نہیں، کچھ نہیں ہو رہا ہے، غلط ہے، اس حقیقت پسندی، وسیع النظری اور جامعیت کا ثبوت دینے کا حیدرآباد میں اور بھی اچھا موقع ہے، یہاں تعلیم بھی ہے اور قوت عمل بھی، یہاں نئے نئے ادارے، نئی نئی تنظیمیں اور تحریکیں

پیدا ہو رہی ہیں، لیکن مسلمانوں کو ایک اجتماعی قیادت، درست مشورے کی ضرورت ہے۔

ہماری ذمہ داری

ایک طرف تو عقائد کے بارے میں، اصول کے بارے میں، شریعت کے منصوصات کے بارے میں پہاڑ کی سی استقامت اور فولاد کی صلابت ہو، دوسری طرف زندگی کے مسائل میں پورا فہم، پوری دانشمندی، پوری باخبری اور پوری ہمدردی، یہ دونوں چیزیں ہوں گی تو ان شاء اللہ ہم موجودہ حالات سے نہ صرف یہ کہ عہدہ برآ ہو جائیں گے، بلکہ مجھے پوری امید ہے کہ قیادت آپ کے پاس خود آئے گی، مسلمانوں میں سیاسی شعور "الوعي السياسي" (شہری شعور) الوعي المدني (Civil Sense) پیدا کرنا ضروری ہے، وہ جس محلہ میں رہیں ممتاز نظر آئیں، اور معلوم ہو کہ یہ مسلمانوں کا محلہ ہے، مسلمانوں کے گھر ہیں، دین کو اس کی حقیقی روح اور مظاہر کے ساتھ ایک خوش اسلوب شہری زندگی، انسانیت دوستی، حقیقت پسندی، ہوش مندی، ملک کے لیے فکرمندی، اس کو بچانے کے لیے خطر پسندی اور مہم جرأتی کی ضرورت ہے، اس کے لیے آپ خود نمونہ بنیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے نمونہ پیش کریں۔

وصلى الله تبارك وتعالى على سيدنا ومولانا محمد وآله وصحبه وسلم۔[1]

---

(۱) ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو مجلس علمی (حیدرآباد) کی ایک نشست میں کی گئی تقریر، جس میں بڑی تعداد میں حیدرآباد کے علمائے کرام، فضلائے مدارس اور دینی اداروں اور تنظیموں کے سربراہ تشریف رکھتے تھے، ماخوذ از "تحفۂ دکن"، ص: ۲۱-۳۶)۔

حالات کا نیا رخ اور علمائے دین کی ذمہ داری

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ﴾ [سورۃ فاطر: ۳۲]

"پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا، تو کچھ ان میں سے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں، اور کچھ خدا کے حکم سے نیکیوں میں آگے نکل جانے والے ہیں، یہی بڑا فضل ہے۔"

داعی امت

عزیزو اور بھائیو! دین ہو، آسمانی تعلیمات ہوں، صحیح دعوت یا اعلیٰ سے اعلیٰ اصول ہوں، ان میں سے کوئی چیز خلا میں نہیں رہ سکتی، اگر اس تعلیم و دعوت کے ساتھ انسانی زندگیاں، ان کے حاملین اور زندہ اور مکمل پیکر نہ ہوں تو ان کا تسلسل قائم نہیں رہتا، ادیانِ سماوی کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ اور اخلاقی تعلیمات کی تاریخ بھی اسی کی شہادت دیتی ہے، اگر ایسا ممکن ہوتا اور سنت الٰہی اور فطرت انسانی اس کی اجازت دیتی تو پھر اتنا کافی ہے کہ آسمان سے صحیفے آجاتے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیے جاتے اور اعلان کر دیا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے صحیفے اور آسمانی کتابیں آگئی ہیں، وہ فلاں جگہ محفوظ ہیں، جس کا دل چاہے جائے لے آئے، اور عمل کرے، لیکن پہلے اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو پیدا کرتا ہے، پھر ان کی بعثت ہوتی ہے، ان پر وحی کا نزول ہوتا ہے، اور اس کا پہلا نمونہ وہ خود ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے آنحضرت (ﷺ) کی

سیرت وحیات طیبہ اور اخلاق وشمائل کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا "کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنُ"[1] (رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی کو دیکھنا ہو تو قرآن مجید پڑھ لو اور دیکھ لو) اور آنحضرت (ﷺ) کے ساتھ تو اللہ کا خصوصی معاملہ اور مزید انعام یہ تھا کہ (حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے الفاظ میں) آپ کی بعثت "بعثت مقرونہ" (دوہری بعثت) تھی، یعنی آپ انسانوں کی طرف مبعوث کیے گئے تھے، اور آپ کی تعلیمات کو دنیا میں پھیلانے اور ان کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک پوری امت کی بعثت عمل میں آئی تھی، اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ تنہا امت مسلمہ کے لیے بعثت یا اس کے ہم معنی اور مرادف الفاظ استعمال ہوئے ہیں، فرمایا گیا:

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ [سورة البقرة: ١٤٣]

"اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں) تم پر گواہ بنیں۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ [سورة آل عمران: ١١٠]

"مومنو! جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر یقین رکھتے ہو۔"

اس سے زیادہ صاف الفاظ حدیث میں آئے ہیں، مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا: "إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ"[2] (تم آسانی پیدا کرنے کے لیے پیدا اور مقرر کیے گئے ہو مشکلات پیدا کرنے کے لیے نہیں۔)

صحابہ کرامؓ نے بھی اس سے ملتے جلتے الفاظ استعمال کیے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ جب

---

(١) رواه أحمد في مسنده عن السيدة عائشة رضي الله عنها، حديث رقم: ٢٥١٠٨، ٢٥٨١٦، ٢٦٣٣٣ (٢) رواه أحمد في مسنده عن أبي هريرة، حديث رقم: ٧٢٥٤، ٧٧٨٦

رستم سپہ سالار افواج ایران نے حضرت ربعی ابن عامر سے جو مسلمانوں کے نمائندہ وسفیر بن کر آئے تھے، پوچھا کہ "تم کیسے آئے؟" "مَا الَّذِيْ جَاءَ بِكُمْ؟" تو اس کے جواب میں انہوں نے زبان نبوت ہی کے الفاظ استعمال کیے، انہوں نے کہا: "اَللّٰهُ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللّٰهِ وَحْدَهُ" "اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ ہم اس کے حکم الٰہی سے اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں داخل کریں"۔ اس سے آپ سمجھ لیجیے کہ کوئی دین خلا میں نہیں رہ سکتا، دین سے پہلے نبی کی شرط ہے، پھر نبی کے ساتھ امت کی شرط ہے، اس کے اصحاب تربیت یافتہ لوگوں کی شرط ہے، جس کا بہترین نمونہ آپ کو سیرت نبوی میں ملتا ہے، اس کے بعد یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہنا چاہیے۔

نائبین انبیاء کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا

میں نے آپ کے سامنے جو آیت پڑھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "توریث" یعنی نائبین انبیاء اور حاملین کتاب کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، اس طرح وارثین انبیاء اس امانت کے حاملوں اور دین کے نمائندوں کی بڑی ذمہ داری ہے، اس دین کے بارے میں بھی، اپنے ماحول ومعاشرے اور اپنے ملک کے بارے میں بھی، اور پوری انسانیت کے بارے میں بھی، جس کی قسمت دین صحیح اور آسمانی تعلیمات سے وابستہ ہے، اسی حقیقت کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ"[1]

"اس علم کے نسل میں ایسے عادل و متقی حامل و وارث ہوں گے جو اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف، اہل باطل کے غلط انتساب ودعوے اور جاہلوں کی دوراز کار تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔"

---

(1) رواه البيهقي في المدخل مرسلا، كما ذكره صاحب مشكاة المصابيح في كتاب العلم، الفصل الثاني، حديث رقم ٢٤٨

وارثین کتاب، نائبین انبیاء اور عام فہم الفاظ میں "علمائے دین" کی یہ اتنی بڑی ذمہ داری اور اتنا نازک معاملہ ہے کہ اگر اس کا صحیح طور پر ادراک ہو تو جن لوگوں کو اللہ نے یہ شرف عطا فرمایا ہے، اور ان کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے، ان کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں، راتوں کی نیند اڑ جائے اور کھانے پینے کی لذت ختم ہوجائے اور ان کا سکون ہمیشہ کے لیے جاتا رہے۔

حاملین دین کا عمل کے اعلیٰ معیار پر ہونا ضروری

دراصل حاملین وشارحین دین حق کی سیرت واخلاق پر عوام کی دین سے وابستگی، اس سے عقیدت، اس پر اعتماد، اور صحیح عقیدہ ومسلک کے بقا کا انحصار ہے، ان کی ذرا سی غلطی کیا اثر پیدا کرسکتی ہے، اس رابطہ کو کتنا کمزور کرسکتی ہے، جو امت اور دین کے درمیان قائم ہے، ان کی اخلاقی کمزوری، جماعت کا اخلاقی تنزل، کردار کی پستی، دنیا طلبی، دولت پرستی، قوت واقتدار کی تقدیس، خواہشات نفس اور ذاتی مفادات کے سامنے سپر اندازی، اور انتشار پسندی پورے معاشرے پر کیا اثر ڈال سکتی ہے، اور اس عہد وملک کی پوری نسل کو کس طرح متزلزل ومتاثر کردیتی ہے، اگر اس کا صحیح ادراک ہو تو ہمارے مدارس کے بام ودر ہی نہیں مساجد کے محراب ومنبر بھی کانپنے لگیں، مشہور حدیث صحیح سے بڑھ کر کوئی اس حقیقت کی عکاسی ومصوری نہیں کرسکتا، فرمایا گیا:

"أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ"۔[(1)]

"یاد رکھو جسم انسانی میں ایک مضغۂ گوشت ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہوجائے تو پورے جسم کا نظام درست رہے گا، اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورے جسم کا نظام بگڑ جائے، خبردار رہو، وہ مضغۂ گوشت دل ہے۔"

---

(1) رواہ البخاري في صحيحه، حديث رقم: ۲۰

اپنی جگہ سے کھسک جائے تو جہاز سیکڑوں میل کے حساب سے اپنی منزل مقصود سے دور ہوجاتا ہے۔ علماء کی جماعت درحقیقت ملت وانسانیت کے لیے "قطب نما" ہے جس سے قبلہ کی سمت متعین ہوتی ہے، اس لیے اس کا صحیح اور سچا رہنا اور اپنا کام کرتے رہنا ضروری ہے، اگر علماء کا تعلق اللہ کے ساتھ درست ہے، اگر ان کے اندر اخلاص واخلاق پایا جاتا ہے، وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مستعد اور سرگرم ہیں، اور ان اعلیٰ صفات سے متصف ہیں جو کسی دور میں نائبین انبیاء اور وارثین کتاب میں پائی جانی چاہئیں، تو کم سے کم اس ملک میں دین کا مستقبل محفوظ ہے، لیکن اگر یہ نہیں ہے تو پھر دنیا کی کوئی تدبیر اس ملک میں دین کو بچا نہیں سکتی۔

اسپین مسلمانوں نے کیسے کھویا؟

اندلس (اسپین) پر بڑا تحقیقی کام ہوا ہے۔ اسلام کے وہاں سے بالکل جلا وطن ہوجانے کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی (خدا نہ کرے اب قیامت تک نہ ملے اور مسلمانوں کو پھر کوئی ایسا حادثہ پیش نہ آئے) یہ وہ بدقسمت ملک ہے جس کو اسلام کی دولت سے بالکل محروم کر دیا گیا، اس کے اسباب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بڑی بصیرت افروز کتابیں موجود ہیں، مجھے خود بھی خدا نے اس ملک کی زیارت وسیاحت کا موقع دیا، لیکن ابھی تک اس نقطۂ نظر سے تحقیقی کام ہوا ہے کہ وہاں کے حکمرانوں سے کیا غلطیاں ہوئیں، وہاں کون کون سی سیاسی بے تدبیری اور بے دانشی عمل میں آئی؟ مورخین ومصنفین نے اس کی زیادہ تر ذمہ داری حکمرانوں کے اختلاف اور شمالی اور جنوبی عربوں (عدنانیوں اور قحطانیوں یا یمنیوں اور حجازیوں) کی آویزش ورقابت پر ڈالی ہے۔

لیکن ایک پہلو ایسا ہے جو ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے اور اس پر کام نہیں ہوا ہے، وہ یہ کہ وہاں کے علماء سے کیا غلطیاں ہوئیں؟ انہوں نے کیا کمزوری دکھائی؟ ان کے اندر کیا اخلاقی انحطاط، دنیا طلبی اور انتشار واختلاف کی بیماری پیدا ہوگئی تھی جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

ہماری وضع کے خلاف ہے، لیکن بے تکلف ایک مسلمان کی پردہ دری کریں گے، افساد ذات البین اور تفریق بین المسلمین میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، اس میں کوئی حرج نہیں کہ دو ذمہ داروں کو ایک دوسرے سے لڑا دیں، کسی ادارے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں، جن چیزوں کی حرمت منصوص ہے مثلاً غیبت، چغل خوری، اتہام، دروغ بافی، وہ ہماری مجلسوں میں دن رات ہوگی، یہ کیا ہے؟ یہ خام برداری خدا کے یہاں نہیں چلتی، وہ عالم الاسرار و علام الغیوب ہے، وہ ظاہر سے دھوکہ نہیں کھاتا، خیانت حرام، کام چوری حرام، پیسے لے کر کام نہ کرنا حرام، مسلمان کی توہین اور عالم کی تذلیل حرام، بے تحقیق و بے ثبوت بات کہنا یا سن کر فوراً اس کو مان لینا اور اس کی اشاعت کرنا حرام، حدیث میں آتا ہے:

"كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ" (1)

"انسان کے جھوٹے ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ جو کچھ اس کے کان میں پڑے وہ اس کا چرچا کرنا شروع کر دے"۔

قرآن شریف میں تاکید کی گئی ہے، اور تعلیم دی گئی ہے

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾ [سورة الحجرات: ٦]

"مومنو! اگر کوئی بدکردار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو"

یہ سب منصوصات قطعی ہیں، لیکن ہمارے صحیفۂ اخلاق اور ہمارے اصول و ضوابط میں ان کی کوئی اہمیت نہیں، ہمیں انہیں مراتب کے ساتھ اور اسی ترتیب و تناسب کے ساتھ جو خدا اور اس کے رسول نے قائم کی ہے، شریعت کے احکام اور دین کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیے، محرمات، مکروہات، مستحبات اور مباحات سب کا درجہ الگ الگ ہے، ہم ایک عرفی دین کے پابند ہو گئے ہیں، اور جو چیزیں ہمارے عرف میں ناپسندیدہ اور قابل نفرت نہیں ہیں، ہم بے تکلف ان چیزوں کا ارتکاب کر لیتے ہیں، جن سے بعض اوقات پوری امت کو نقصان پہنچتا ہے، جن سے اداروں کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی ہے، جن سے ایک متحد اور ہم مسلک جماعت میں سخت انتشار پیدا ہو جاتا ہے، اور اس سے ان تمام مقاصد اور پورے مسلک کو نقصان

(1) أخرجه مسلم في صحيحه في المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع، حديث رقم: ٧

پہنچتا ہے جن کی یہ جماعت حامل ہے اور ان کی ایک علامت بن گئی ہے، یہ عمارت جو آپ دیکھ رہے ہیں، ایک تناسب پر قائم ہے، اگر یہ تناسب ختم کر دیا جائے تو یہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی، دین کا ایوان بھی خاص تناسب پر قائم ہے، وہ بھی اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔

عظیم مصلحین کی ضرورت

دوستو اور عزیزو! یاد رکھیے کہ ایسے نازک وقت پر اگر کوئی چیز فوری طور پر زوال سے بچا سکتی ہے تو وہ بلند و بالا شخصیتیں ہیں، دیکھیے دسویں صدی ہجری میں ہندوستان کا ملی و دینی حلقہ اخلاقی طور پر مریض ہو گیا تھا، اور اس کا اثر یہ پڑ رہا تھا کہ ہندوستان میں دین کا مستقبل نہ صرف خطرے میں پڑ گیا تھا، بلکہ صاف نظر آ رہا تھا کہ ہندوستان کا رخ کم سے کم ذہنی اور تہذیبی ارتداد کی طرف ہے، درباری علماء کا نمونہ کیا تھا؟ آپ کو ملا مبارک اور ابوالفضل و فیضی کی سیرت و کردار کے مرقع میں دیکھیے، زیادہ علماء کے نام نہیں لیتا کہ تاریخ کا سو فیصدی اعتبار نہیں، لیکن اس زمانہ کے صدر الصدور اور مخدوم الملک بھی اخلاقی انحطاط کا شکار نظر آتے ہیں، ان کی جاہ پرستی، دولت اندوزی، آپس میں حسد و رقابت اور عزت و اقتدار کے لیے کشاکش کی شہادتیں تاریخ سے ملتی ہیں، ابوالفضل و فیضی کے کردار کے متعلق جو انہوں نے دربار اکبری اور حکومت وقت میں ادا کیا، تنہا ملا عبدالقادر بدایونی کی تحریروں پر اعتماد کرنے کی ضرورت نہیں جتنا اس کی توثیق خود ابوالفضل کی تحریروں سے ہوتی ہے۔ ( )

اس وقت اچانک ایک شخصیت نمودار ہوتی ہے جس کا نام نامی حضرت شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) ہے، وہ آتے اور انہوں نے کچھ آدمیوں کو تیار کیا، جو اس اخلاقی اور انسانی سطح سے بلند تھے جس پر عام طور پر سرکاری درباری علماء نظر آتے تھے، اور ایک دم فضا بدل گئی

ع   جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ چہارم ص ۹۳-۱۰۱

اعلیٰ صفات و اخلاق کے حامل اور وسیع النظر علماء کی ضرورت

اگر ہمارے ملک کے دینی حلقوں نے بھی بلند نمونے پیش نہ کیے، اگر صدی بھر ہندوستان میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ یا کسی درجہ میں ان سے نسبت رکھنے والی شخصیت، اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ یا ان سے کسی درجہ میں نسبت رکھنے والی شخصیت پیدا نہ ہوئی، علمی و فکری حیثیت سے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری جیسے فضلاء، وسیع و عمیق النظر عالم، علمی رسوخ اور وقت کے تقاضوں سے باخبری میں مولانا مفتی کفایت اللہ اور ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد بہاری، ذہنی و اخلاقی بلندی اور خودداری و خود اعتمادی کے لحاظ سے مولانا ابوالکلام آزاد، روحانی و تربیتی و دعوتی لحاظ سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ، مولانا محمد یوسف کاندھلوی، مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری جیسے داعی و مربی نہ پیدا ہوئے، تو پھر دیکھیے کہ یہاں ہندوستان میں علماء حق کا وقار نہیں، دین و علم کا وقار اور پھر ایک قدم آگے بڑھ کر ملت اسلامیہ کا وقار بھی خطرے میں پڑ جائے گا، اور ان دینی اداروں اور مدارس کی افادیت و ضرورت بھی مشکوک ہو جائے گی، جو کسی طبقہ کے افراد پیدا کرنے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔

ان حضرات اور ان کے اسلاف کا تعبد و تحمل، ان کی خودداری اور خود اعتمادی، ان کی تعاون علی البر والتقویٰ کی صلاحیت، ان کی ملت کے اجتماعی کاموں میں اپنی بے نفسی کا مظاہرہ، ان کی عالی ظرفی، بلند نظری اور فراخ دلی اور اپنے ہم مسلک بلکہ اپنے متعلقین تک کے کمالات اور محاسن کے اعتراف کی جرأت و توفیق، ان کا استغناء، اہل دول سے بے تعلقی، بے نیازی اور کسی وقتی، ان کی اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں مستعدی و سرگرمی، ان کی زاہدانہ، متقشفانہ زندگی، ان کا ملت کے لیے حقیقی ہمدردی و کرب، یہی وہ صفات ہیں جنہوں نے پہلے بھی ان جماعتوں اور اداروں میں زندگی کی روح پھونک دی تھی، اور زندہ رہنے کا استحقاق پیدا کر دیا تھا، اور یہی صفات آج بھی صرف ان اداروں ہی کو نہیں، پوری ملت کو زوال سے بچا سکتی ہے۔

خصوصیت یہ تھی کہ اس وقت کی پوری انسانیت توحید کے مفہوم سے نا آشنا ہو گئی تھی، اور پست ترین بت پرستی میں مبتلا تھی، شرف انسانی اور مساوات انسانی کا مکمل لوگوں کے ذہن سے بالکل فراموش ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت و عشق کا مکمل تعلق ختم ہو گیا تھا، اور فنائیت و وارفتگی اور اس کو ہر چیز پر ترجیح دینے کا تعلق بھی باقی نہیں رہا تھا۔

عزیزو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت سے جو دور شروع ہوا وہ تقریباً اس وقت تک ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک حد فاصل ہے پچھلے اور بعد کے دور میں، اور جیسا کہ میں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ دنیا میں دو جو متواتر سلسلے ہیں اگر ان کے لیے عنوان تلاش کریں تو دو عنوان ملتے ہیں: ایک ابراہیمیت کا، دوسرے برہمیت۔ میں نے برہمیت میں "لون" کو قصداً شامل نہیں کیا، کہ لوگوں کو غلط فہمی ہو گی، اور میرا مفہوم ادا ہو جائے گا، اور اس کا تعلق کسی خاص ملک، نسل اور خاص عقیدے سے سمجھا جانے کا، یہ دو متواتر سلسلے "ابراہیمیت" اور "برہمیت" ہزاروں برس سے چل رہے ہیں، ایک توحید خالص ہے، جس میں انسانی شرف کا اعادہ اور تجدید ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور فنائیت کا تعلق ہے، اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں توحید کا بار بار تذکرہ ہے، پورے پورے رکوع خصوصاً سورۂ ابراہیم کے آخری رکوع کی آیات میں توحید خالص، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر معمولی تعلق، محبت، عشق، فنائیت، وارفتگی و وارفتگی اور جاں سپاری کا ذکر ہے، جس کا ایک ثبوت حضرت ابراہیم کے عزیز فرزند حضرت اسماعیل کے گلے پر چھری پھیرنے سے ملتا ہے، اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے بھی فرمائی

﴿يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ [سورۂ الصافات: ۱۰۴-۱۰۵]

یہ خصوصیات دین ابراہیمی اور شریعت ابراہیمی کی ہیں، یہ مزاج ابراہیمی اور دعوت ابراہیمی کی خصوصیات ہیں۔

حضرت داؤدؑ و حضرت سلیمانؑ کا دور اور اس کی خصوصیت

اس کے بعد حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کا زمانہ آتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ سلطنتوں کی تنظیم اور صنعت انسانی کی ترقی کا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اوصاف میں خاص طور سے ملک سلیمان کا ذکر کیا ہے:

﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي﴾ [سورۃ ص: ۳۵] اور ﴿فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ﴾ [سورۃ ص: ۳۶]

اس کے بعد جنوں کا تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر میں ان کے لیے لوہے کو نرم کرنے کے سلسلے میں ﴿وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ﴾ [سورۃ سبا: ۱۰] کا تذکرہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور صنعتوں کی وسعت و پھیلاؤ اور ترقی کا دور ہے، اس کی تنظیم کا دور ہے، اس کے بعد ہمارے سامنے یونان کا دور آتا ہے، جو فلسفہ مابعد الطبیعیات، ریاضیات اور طب کی ترقی کا دور کہا جاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کی مسیحائی

حضرت مسیح علیہ السلام کا ظہور اور ان کی پیدائش عین یونانی علوم کے ارتقاء کے دور میں ہوئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں ہم خاص طور سے دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے ہیں، مریضوں کو شفا دیتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مسیحائی اور ان کے لیے مائدے کے نزول کا ذکر قرآن مجید میں ملتا ہے، معجزات کا کثرت سے ظہور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ہوتا ہے، غرض کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں جو ماحول تھا، ان میں اور حضرت عیسیٰ کے معجزات میں بڑی مناسبت پائی جاتی تھی۔

خاتم الانبیاء (ﷺ) کا دور اور اس کی خصوصیات

لیکن حکمت الٰہی نے خاتم الانبیاء (ﷺ) کے لیے جس دور کا انتخاب کیا ہے، وہ دور

ایک پیغام دیا جانے والا ہے، یہ بتایئے کہ وہ پیغام کس لفظ سے شروع ہو سکتا ہے؟ میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سب کے ذہن میں مختلف الفاظ آ سکتے تھے، کوئی کہتا کہ "اپنے آپ کو پہچانو" اس لیے کہ اس وقت الٰہی معرفت ناپید ہو چکی تھی، کوئی کہتا "اعْبُدُوا رَبَّكُمْ" اپنے رب کی عبادت کرو، کیوں کہ صحیح عبادت نہیں ہو رہی تھی، کوئی کچھ اور کہتا، شاید کوئی بھی یہ نہ کہتا کہ "اِقْرَأْ" کے لفظ سے وحی شروع ہو گی، اس لیے کہ جس پر وحی نازل ہو رہی تھی وہ امی تھا، جس امت میں وہ مبعوث ہوئے تھے وہ امی تھی "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ" [سورۃ الجمعۃ: ۲]، جس کو یہودی امی کہتے تھے، اور جس ملک میں آپ کو مبعوث ہونا تھا وہ امی تھا، جس شہر میں وحی نازل ہو رہی تھی، وہاں تو شاید سارے مکہ میں دو چار قلم مل سکتے ہوں، پڑھے لکھے انسانوں کے لیے دنیا میں بہت سے لفظ ہیں، عرب کاتب کا لفظ بولا کرتے تھے، گویا سب سے بڑا امتیاز جو اس ملک کا سمجھا جاتا تھا وہ قلم سے کام لینا تھا، وہاں تحریر سب سے زیادہ مشکل چیز سمجھی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس امت کے اندر علم کو قبول کرنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی جو غیر معمولی صلاحیت رکھی ہے، اور اس امت اور علم کے درمیان جو رشتہ اس نے رکھا ہے، جسے ہم مقناطیس سے تعبیر کر سکتے ہیں، اسی لیے ہر دور میں اس امت کا علم سے رشتہ باقی رہا ہے، اور اسی لیے ہر دور میں نئے نئے شہسواروں، نئے نئے ماہرین فن اور ذہین انسانوں کو یہ امت پیدا کرتی رہی ہے، اور اس میدان میں کامیابی حاصل کرنے کا موقع دیتی رہی ہے، اگر کوئی ایسا انقلاب نہیں آتا جس میں صلاحیتیں بالکل مسخ ہو جائیں اور انسانی ذہن معطل ہو کر رہ جائے اور کام کرنا چھوڑ دے، جب تک علم کا سفر جاری رہے گا، مسائل پیدا ہوتے رہیں گے، خواہ ان کا تعلق تمدنی، علمی، معاشرتی، اور سائنسی اور اقتصادی امور سے ہی ہو، مذہب کی روشنی میں ان مسائل کو برابر حل کیا جاتا رہے گا، مثال میں ہم صحابہ کرام، ائمہ اربعہ اور امت کے دیگر مجتہدین کو پیش کر سکتے ہیں، اور یہ محض اتفاقی بات نہیں کہی جا سکتی، صحابہ کرام میں ایسے ذہین اور مخلص انسان تھے کہ انہوں نے روم و ایران جیسی ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کا مقابلہ کرنے میں ذہنی صلاحیت کا ثبوت دیا جس کی نظیر کوئی دوسرا مذہب پیش نہیں کر سکتا، اسی طرح ائمہ اربعہ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام

شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسے جینیس قانون ساز تھے کہ انہوں نے زندگی اور دین کے رہنما
اصولوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے میں اپنی غیر معمولی صلاحیت کا ثبوت دیا کہ اس
پورے عہد میں یہ صلاحیت نادر و نایاب تھی، نہ یونانیوں میں، اور نہ رومانیوں میں تھی، نہ کسی
اور قوم میں، یہ لوگ اپنے زمانے کے جینیس ترین انسان تھے، اور ان کے کارنامے صدیوں پر
محیط ہیں، ان کے کارناموں کی صحیح عظمت و اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ آج آسانی سے
نہیں لگایا جا سکتا ہے، کوئی شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ جب یونانی علوم عربی میں منتقل ہوئے
تو عقلی حلقوں پر کتنا غیر معمولی سحر تھا اور کس طرح لوگ ان کے سامنے مبہوت اور ششدر
تھے، اور کس طرح فیشن کے طور پر لوگ باتیں کرنا اور ان کی نقل کرنا فخر و اعزاز سمجھتے تھے، لیکن
اللہ تعالیٰ نے امام ابوالحسن اشعریؒ، سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ، امام غزالیؒ، مولانا جلال الدین
رومیؒ، شیخ معین الدین چشتیؒ، نظام الدین اولیاءؒ، خواجہ بہاؤ الدینؒ، امام ابن تیمیہؒ، مجدد الف
ثانیؒ، شاہ ولی اللہ اور بہت سے جینیس شخصیتوں کو اپنے اپنے وقت پر پیدا کیا، جنہوں نے زمانہ کا رخ
پھیر دیا، خطرات کا انہوں نے پوری جرأت سے مقابلہ کیا، نوجوان نسلوں کے دل و دماغ کو
شکوک و شبہات سے پاک کر کے ایمان و یقین کی بنیادیں از سر نو فراہم کیں، بالکل یہی
مرعوبیت نئے دور کی جدید انگریزی تہذیب اور جدید سائنس کے بارے میں تھی اور کس طرح
لوگ یورپ کی سائنس اور ٹیکنالوجی پر ایمان لاتے تھے، اور اس سے ایسے مبہوت ہوتے تھے
کہ اگر چہ دین کا صاف انکار نہیں کرتے تھے، لیکن کشمکش میں ضرور مبتلا ہو گئے تھے، اس
زمانہ کے راسخ العقیدہ خاندانوں کے مشائخ اور صالحین کا حال یہ تھا کہ اگر ان کے والدین کی
سرپرستی اور بزرگوں کی صحبت ان کو نہ ملی ہوتی، اور ان کے آغوش میں انہوں نے تربیت نہ
حاصل کی ہوتی تو ذہنی و اعتقادی ارتداد عام ہوتا اور پورا ہندوستان اس کا شکار ہو جاتا۔

اور اگر اللہ تعالیٰ عین وقت پر دستگیری نہ فرماتا تو نہ معلوم اس ملک کے مسلمانوں کا کیا
حال ہوتا، اور یہ صرف ہندوستان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ جب بھی اسلامی تاریخ کے طویل
دور میں اس طرح کے حالات پیش آئے تو اللہ تعالیٰ نے ہر وقت ایسے افراد پیدا کیے، جنہوں
نے اس امت کا رشتہ دین سے باقی رکھا، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہنا چاہیے۔

مذاہب تاریخ سے نہیں کردار سے سفر جاری رکھتے ہیں

ہمارا یہ فرض ہے کہ اس مہم کو جاری رکھیں۔ ہم یہ بات اپنے عزیز طلبہ سے کہنا چاہتے ہیں، کسی جماعت میں کسی بڑے عالم و مصنف کا اور مفکر کا پیدا ہو جانا کافی نہیں ہوتا، ادارے یہاں تک کہ ادیان و مذاہب بھی تاریخ سے نہیں چلتے۔ بلکہ وہ تحریک اور تسلسل سے چلتے ہیں، وہ اپنی افادیت اور صلاحیت ثابت کرنے سے چلتے ہیں۔ کوئی دینی تحریک کوئی بڑا مفکر پیدا کرے، بلند قامت اور وسیع نظر مصنف پیدا کر دے تنہا یہ کافی نہیں ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب بھی اپنی جماعت کے کارناموں پر فخر کرنے کی کمزوری پیدا ہو جائے تو پھر تو اُسے فکر یہ میں خلل ہو جاتا ہے، اور اضمحلال پیدا ہونے لگتا ہے۔ ایک عرب شاعر نے بڑے لطیف انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ:

أَلْهَى بَنِي تَغْلِبَ عَنْ كُلِّ مَكْرُمَةٍ

قَصِيدَةٌ قَالَهَا عَمْرُو بنُ كُلْثُومِ

بنو تغلب کو ہر قسم کے مردانہ کارناموں اور کسی بڑی فتح کے حاصل کرنے اور کسی بڑے اقدام سے صرف ایک بات نے روک رکھا ہے، وہ یہ کہ یہ لوگ صرف عمرو بن کلثوم کا قصیدہ پڑھتے اور سر دھنتے رہتے ہیں، یہ مرض جماعتوں میں بھی پیدا ہوتا ہے اور اداروں میں بھی، کہ وہ جماعتیں ان کے لیے سرمایۂ فخر، یعنی جماعت یا اس جماعت کے کسی نامور فرد کی تصنیفات، تحقیقات اور اس کی ذہنی بلندی ان کے لیے سرمایۂ فخر بن جاتی ہے، لیکن اس سے کام نہیں چلتا، جماعت ہو، کوئی ادارہ ہو یا مدرسہ۔ بلکہ میں اس سے باہر نکل کر کہتا ہوں کہ امت اسلامیہ کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے اپنے دور میں غزالی، ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کو پیدا کیا، اور ہم نے فلاں فلاں شہر بسائے، سمرقند و بخارا اور غرناطہ، اشبیلیہ اور دہلی ہم نے بسائے، بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں، اور اپنے اپنے دور کی ذہنی و اعتقادی بے چینیوں کا جائزہ لیتے رہیں، ان کے اسباب و محرکات تلاش کریں، دینی حقائق اور اصول و تعلیمات اور زندگی کے واقعات اور زندگی کے عملی مسائل کے درمیان

مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کریں، ہر دور میں اسلامی قانون کی برتری کو ثابت کریں۔

علوم میں ماہرانہ دسترس حاصل کی جائے

علامہ اقبال نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا مجدد وہ ہے کہ جو اسلامی قوانین کی برتری دوسرے قوانین کے مقابلہ میں ثابت کرے، علامہ اقبال نے جو بات آج سے ساٹھ برس پہلے کہی تھی، وہ آج کے زمانہ میں ایک عملی حقیقت بن گئی ہے، آج ہمارے سامنے جو سب سے بڑا چیلنج ہے اور ہم لوگ اس کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت خصوصاً عائلی قوانین کی معقولیت، افراد اور خاندانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس کا سب سے بہتر ہونا ثابت کریں۔

ہم اپنے عزیز طلبہ سے یہ کہیں گے کہ وہ مطالعہ و محنت سے علوم پر ماہرانہ دسترس حاصل کریں، پھر جدید مسائل سے واقف ہوں، اور ان کا دین کی روشنی میں حل پیش کریں، دینی علوم میں اختصاص و گہرائی اور جدید علوم سے واقفیت اور اس کے بارے میں ٹھیک اور صحیح کا موقف ان دونوں کو جمع کرنا ضروری ہے۔

ندوۃ العلماء کا امتیاز اور پیغام

ندوۃ العلماء کو فخر ہے کہ اس کا انتساب مولانا سید محمد علی مونگیری جیسے بالغ نظر اور روشن ضمیر اور سیرۃ النبی کے مصنف علامہ شبلی جیسے متکلم وقت، مورخ زمانہ اور سیرت نگار یگانہ اور ادیب سے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج تک علمی و دینی مسائل پر قلم اٹھانے اور ان کو سنجیدہ و موثر طریقے سے پیش کرنے کے لیے کم سے کم ہمارے علم میں علامہ شبلی کے اسلوب سے بہتر کوئی اور اسلوب نہیں، ان ہی کے نقش قدم پر سید سلیمان ندوی، عبد السلام ندوی اور دوسرے تربیت یافتہ حضرات ہوئے، جنہوں نے اپنے اپنے وقت پر اس سلسلہ کو جاری رکھا، لیکن یہ تنہا کافی نہیں، اور آپ جب اللہ تعالیٰ کا شکر کریں تو مجبور ہوں کہ ان ہی حضرات کا نام لیں، اور اس

فہرست میں اضافہ ہو، یہ اس ادارے کے زوال اور اضمحلال کی دلیل ہے، اور یہ پوری امت کے لیے خطرہ ہے، یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ کسی دائرے میں اس معیار کے لوگ پیدا نہیں ہو رہے ہیں جو مطلوب ہیں، بعض بڑے بڑے اسلامی ملکوں میں ہونے کا اتفاق ہوا، وہاں بھی یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ وہاں بھی اب ایسی علمی و فکری قیادت موجود نہیں جو اس نوجوان نسل کی تشفی کا سامان فراہم کر سکے جو براہ راست یورپ سے پڑھ کر آ رہی ہے، کوئی ایسا رسالہ نہیں جس میں جدید عمرانی مسائل کا دین کی روشنی میں حل پیش کیا جاتا ہو اور زبان و علم و تحقیق کا معیار برقرار رکھا ہو، ہر رسالہ یا جماعت اپنے مسلک اور مخصوص حلقہ کے بارے میں مضامین شائع کرتا ہے، اگر کوئی تنظیم یا جماعت ہے تو وہ موجودہ حکومت سے بے اطمینانی ظاہر کرنے اور محدود جماعتی و گروہی اور سیاسی مفاد حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کر رہی ہے، یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے کہ علماء دین کا کام یہی تھا کہ نوجوان نسلوں کا اعتماد اسلام پر بحال کریں، اسلام کی حقانیت اور اس کی ابدیت و صلاحیت کو ثابت کریں، اور زندگی کے تمام مسائل میں اس کی قیادت کا ثبوت دیں، اگر یہ ذاتی و سیاسی مفادات میں الجھ جائیں، اگر اس امت میں بڑے بڑے صالحین اور اتقیاء اور دین پر جان دینے والے موجود ہوں، تب بھی یہ ضرورت باقی رہے گی۔

ترکی کے المیہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ علماء نے اس دور کے تقاضوں اور نئی نسل کی بے چینی کو رفع کرنے اور اسلام کو سیاسی، مذہبی، فکری، اجتماعی مسئلہ انتظامی اور قائدانہ حیثیت سے اس کی برتری ثابت کرنے کی صلاحیت کا ثبوت نہیں دیا، جس کی وجہ سے ترکی لادینیت کی راہ پر لگ گیا، یہی خطرہ مسلم ممالک کے لیے موجود ہے۔

آپ کا اولین اور بنیادی فرض ہے کہ آپ اس کام کے لیے اپنے کو تیار کریں، اور دینی فکری اور علمی قیادت کے خلا کو پیدا نہ ہونے دیں، اور نہ معلوم یہ مرحلہ کب آ جائے، یہ مرحلہ اگرچہ ہر وقت موجود ہے، یہ بات جب ہوگی جب آپ پوری محنت کریں، ماہر اساتذہ سے علوم حاصل کریں، ان میں مہارت اور دسترس پیدا کریں، پورے شوق و احترام سے یہ علوم حاصل کریں، پھر ایک ایک موضوع کا انتخاب کریں، پہلے اجمالی طور پر پھر تفصیلی طور پر مطالعہ

یہ دین زندہ ہے اور زندوں سے قائم ہے

دین کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے

اس دین کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر اور مقدر کر دیا ہے کہ اس کے لیے زندہ اشخاص برابر پیدا ہوتے رہیں گے، کوئی درخت اس وقت تک سرسبز و شاداب اور زندہ درخت نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ بار آور نہ ہو، اس میں نئی نئی پتیاں اور نئے نئے شگوفے نہ کھلتے رہتے ہوں، یہ دین زندہ ہے اور زندہ انسانوں کے لیے ہے، اور اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، وہ دین مٹ گئے، ختم ہو گئے، جنھوں نے روحانیت کے میدان میں، علم کے میدان میں، فکر کے میدان میں، قیادت کے میدان میں زندہ اشخاص پیدا کرنے بند کر دیے۔ انسان زندہ اشخاص سے متاثر ہوتے ہیں، چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے اور چراغ سے چراغ جلنا چاہیے اور جلتے رہنا چاہیے، اور اگر اس امت کو باقی رہنا ہے تو اس امت کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندہ اشخاص پیدا کرے، دین کا درخت، علم کا درخت، فکر کا درخت، اصلاح اور اس کا درخت روحانیت نئے نئے برگ و بار لاتا رہے۔ نئے نئے شگوفے کھلاتا رہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ میری امت باران رحمت کی طرح ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے ابتدائی قطرے مردہ زمین کے لیے زیادہ حیات بخش ہیں یا بعد کے۔

میں تاریخ کہتا رہا ہوں، میرے شعور اور تصنیف و تالیف کی عمر زیادہ تر اسی کوچے میں گزری اور میں کہہ سکتا ہوں کہ

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

ہوسکتا ہے (فیض کے جو طریقے ہیں ان کے ذریعہ) اس میں غلط فہمی نہ ہو، لیکن رہنمائی زندہ انسانوں ہی سے حاصل ہوتی ہے، کسی نسل میں سب کچھ ہے، بڑے کتب خانے ہیں، تاریخ کے بڑے بڑے ذخیرے ہیں، لیکن زندہ ہستیاں نہیں ہیں، جن کے قلوب سے اور جن کے اجتہاد و فکر سے، جن کے تفقہ سے، جن کی بصیرت سے ہم روشنی حاصل کریں، اس نسل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

دین تازہ ہوتا رہے گا

حدیث صحیح میں ہے کہ ''إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا ''[1] سنن کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر سو برس میں ایک مجدد بھیجتا رہے گا، جو اس دین کو تازہ کردے گا، اور تجدید کا فرض انجام دے گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت تو وہ دین کو تازہ کردے گا، پھر وہ سلسلہ ختم ہوجائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عرصہ تک اس کا وجود رہے گا، ''مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا'' کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آئے اور ہفتہ دو ہفتہ کے لیے دین کا چرچا ہوگیا اور چلے گئے، ان میں سے کسی بھی بزرگ کا حال پڑھیں، کسی کا اثر سو برس تک رہا اور بعض ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کا اثر صدیوں تک رہا۔

ریلوے لائن پر ایک چھوٹی گاڑی چلا کرتی تھی، (اور غالباً اب بھی چلتی ہے) جس کو ٹرالی کہتے تھے، لوگ اس کو ٹھیلتے تھے، اور پھر اس پر بیٹھ جاتے تھے، اور وہ چلتی اور پھسلتی رہتی تھی، جب وہ رکنے لگتی تھی تو پھر اتر کر دھکا دیتے تھے، اور بیٹھ جاتے تھے، اس سے لائن کا معائنہ ہوتا تھا، اس امت کی گاڑی کو بھی اسی طرح سمجھیے اور اس کو ٹھیلنے والے اس امت کے علماء اور مشائخ اور مجدد ہیں، یہ اس کو ٹھیل دیتے ہیں، اور وہ خود اپنے پہیوں پر چلتی ہے، یہ نہیں کہ اس کو چلاتے ہی رہتے ہیں، گاڑی خود چلے گی اپنے پہیوں پر، لیکن اس کو ٹھیلنے اور چلانے کے لیے زندہ انسانوں کی ضرورت ہے، وہ کوئی میکانکل چیز نہیں، زندہ انسان اس کو بڑھاتے ہیں اور ٹھیلتے ہیں، اور وہ اپنے پہیوں پر چلتی ہے، کیونکہ ٹرالی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت

[1] أخرجه أبو داود في سننه، حديث رقم: ٤٢٩١

ہے، پٹریوں میں اتنی چکناہٹ اور پہیوں میں اتنی حرکت و سرعت اور چلنے کی اتنی صلاحیت ہو کہ وہ چل سکے، اور آدمیوں کے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اس کو دھکیل سکیں، اور مسافر جو بیٹھے ہوں وہ ایسے ہوں کہ بیٹھے رہیں اور جم جائیں، اس امت کی روایت یہ ہے کہ جب اس پر تعطل اور بے عملی طاری ہونے لگتی ہے، تو کوئی اللہ کا بندہ آتا ہے اور اس کو دھکا لگاتا ہے، اور پھر وہ خود چلتی ہے، اور کچھ دور تک چلی جاتی ہے۔

میں مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ دونوں کو اس دور کا مجدد سمجھتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ جہاں کہیں بھی علم دین ہے، جہاں کہیں بھی سنت کی دعوت ہے، جہاں کہیں بھی شرک و بدعت سے اجتناب کا جذبہ اور اس سے تنفر ہے، یہ ان دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے، دیکھیے، ایک ایسا بھی انسان تھا جس نے اس زور سے دھکا دیا کہ امت کی گاڑی ساڑھے تین سو سال سے برابر چل رہی ہے، اور اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کتنا چلے، پھر کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہوا اور اس کے دھکے سے اور کتنا چلے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا پورا خاندان حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سوا ڈیڑھ سو برس کے بعد پیدا ہوا، اور ان کے کام کے اثرات تیرھویں صدی کے ابتداء میں ظاہر ہوئے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فریضہ ہے تمام مدارس کا اور تمام علماء کا کہ زندہ اشخاص پیدا کرتے رہیں۔

عالم اسلام کی سب سے بڑی ضرورت

کل میں نے دارالعلوم کورنگی میں ایک بات کہی تھی کہ عالم اسلامی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے علماء ملک میں رہیں کہ وہ نئے مسائل سمجھ سکیں، اور نئے مسائل کے حل پیش کر سکیں، اور اس میں وہ شریعت کی مدد سے، کتاب و سنت کی مدد سے، اصول فقہ اور فقہ کی مدد سے رہنمائی کر سکیں، اس لیے جہاں اور چیزوں کی ضرورت ہے، وہاں ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے متبحر علماء پیدا ہوں جیسے مفتی محمد شفیعؒ صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، اور دوسرے علماء جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہے، پھر اس کے بعد میں نے کہا کہ زمانہ اتنا ترقی کر گیا ہے، اور اب زمانے کے فتنے اتنے سنگین اور

"البحر الرائق" کے مصنف اور "فتاویٰ عالمگیری" کے مصنف پیدا ہوئے، وہ کہے گا: حضرت!
یہ سب صحیح ہے، لیکن جلدی بتائیے، نماز کا وقت بالکل قریب ہے، کہ اس کو کس طرح پاک کیا
جائے؟ کوئی آپ سے یہ پوچھنے آئے کہ ذرا سی یہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی، یہ شعر سمجھ میں
نہیں آیا، اس کے معنی بتائیے، آپ کہیں کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کا
جواب نہیں، عبدالقاہر جرجانی پیدا ہوئے، ابوعلی فارسی پیدا ہوئے، امام زمخشری پیدا ہوئے،
حریری پیدا ہوئے، اور قاضی فاضل پیدا ہوئے، اور ہندوستان میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر
ہوئے ہیں، وہ کہے گا یہ سب ٹھیک ہے، لیکن میں تو بس پڑھا جا رہا ہوں، مطلب مختصر
ہیں، جلدی سے شعر کا مطلب بتائیے، اسی طرح ہر فن کا حال ہے، جس فن کا آدمی آیا تو کہہ دیا
کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔

ہر شہر میں متبحر آدمی ہونے چاہئیں

ہر ملک میں بلکہ ہر شہر میں ایسے متبحر آدمی ہونے چاہئیں جو وقت پر مدد کر سکیں، رہنمائی
کر سکیں، یہ نہ کر سکیں تو کم از کم کسی عالم کا حوالہ دے سکیں، میں خود یہ کرتا رہتا ہوں، کوئی اہم
مسئلہ پوچھنے آتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ہمارے مدرسہ میں مفتی موجود ہیں، ان سے پوچھو
"لکل فن رجال" ہر فن کا شخص الگ الگ ہے، وہ فقہ پڑھاتے ہیں، مثلاً ابن حزم کے متعلق
امام ابن تیمیہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انہوں نے "[illegible]" میں "زلل" و "سقطات" کو لکھ دیا ہے،
وہ بہت ادب کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کو تخریج کرنے کا موقع نہیں ملا، تو ان کو مواقف اور سنن میں
التباس ہو گیا، یہ بات الگ ہے لیکن ہر چیز میں آپ اسلاف کے کارناموں کی فہرست گنانے
لگیں کہ کیسے کیسے آدمی پیدا ہوئے، تو اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص پیاسا ہو اور پانی پینے
آئے اور کہے کہ پانی پلا دیجیے تو آپ اس سے کہیں کہ دنیا میں ایسی ایسی جھیلیں نکلی ہیں اور ندی
ایسی نکلی ہیں، ایسے دریا ہیں، ایسے ایسے مشروبات ایجاد ہوئے ہیں، تو بھائی مشروبات کے
نام گننے سے اور اس میں جو ترقیاں آپ کے اسلاف نے کیں، اس سے کیا ہوتا ہے، اس کو تو پانی
چاہیے، چاہے آپ کوزہ میں دیں، یا مٹی کے ظروف میں دیں، جب جا کر اس کی پیاس بجھے گی۔

خلا پر کرنے کے لیے جانفشانیوں کی ضرورت ہے

علوم کا زوال بلکہ امتوں کا زوال اسی طرح ہوا کہ جب کوئی گیا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے والا نہیں، آج منظر وہی بات کا ہے، جو اٹھتا ہے جگہ خالی کر کے چلا جاتا ہے، آپ سے کیا کہوں، یہ کہنے کی بات نہیں، ہندوستان میں ہم کیا خلا محسوس کر رہے ہیں، کسی مدرسے میں شیخ الحدیث کی ضرورت ہے، شیخ الحدیث نہیں مل رہا ہے، کہیں اصول فقہ پڑھانے والا نہیں مل رہا ہے، حکیم اللہ کے بندے یہاں آ گئے اور کچھ اللہ میاں کے یہاں چلے گئے، ایک انتقال کر گیا تو دوسرا منتقل ہو گیا، ہمارے حق میں نتیجہ ایک ہوا، مطلب یہ ہے کہ خلا پر ہونا چاہیے اور اس کے لیے جانفشانیوں کی ضرورت ہے، یہ کام بغیر جانفشانیوں کے نہیں ہو سکتا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ حدیث کا جید عالم پیدا ہو، فقہ کا کوئی جید عالم پیدا ہو تو اس کے لیے جاں فشانی کرنے کی ضرورت ہے، اور افسوس ہے کہ اب ہمارے مدارس میں اس کا رواج نہیں رہا، سب کچھ ہے لیکن وہ محنت نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ مبالغہ نہیں، غلو نہیں مگر کسی درجہ میں انہماک ہونا چاہیے، یورپ میں جو ترقیاں ہوئی ہیں، اسی لائن سے ان میں بھی استغراق ہے، میں نے واقعات سنے ہیں کہ بعض تحقیقی کام کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہوئی کہ کب صبح ہوئی اور کب شام ہوئی، میرے جاننے والے ایک دوست جرمنی گئے تھے، انہوں نے کہا: ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کب کام شروع کرتے ہیں؟ آپ کا یہ ادارہ کب سے کھلتا ہے؟ تو اس نے کہا: ابھی بتاتا ہوں، وہ اندر گیا اور ایک آدمی سے پوچھا کہ میرا شعبہ کب سے کھلتا ہے؟ اس نے بتایا اتنے بجے، تو آ کر کہہ دیا کہ اتنے بجے سے، میں نے کہا کہ کیوں آپ نے خود کیوں نہیں بتلایا؟ تو اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں، میں اتنی صبح آ جاتا ہوں کہ مجھے ہوش نہیں رہتا اور میں گھڑی بھی نہیں دیکھتا، کام کا جوش اتنا غالب ہوتا ہے۔

یہ انتشار کا دور ہے، آج کل تو بڑی مصیبت یہ ہے کہ آپ یہاں سے جائیے، بہت سی چیزیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی جو انتشار پیدا کرنے والی ہوں گی، آپ ایسے حالات دیکھیں گے جو انتشار پیدا کرنے والے ہوں گے، آپ ایسی تصویریں دیکھیں گے جو ساری ذہنی

یکسوئی ختم کر دیں گی۔ اور اگر نیکی و یژن ہو رہا ہے، تو سبحان اللہ یا انا للہ کہہ دیجیے، اُس زمانے کی خوبی یہ تھی کہ انتشار پیدا کرنے والی چیزیں کم تھیں، اور لوگوں میں علمی استغراق تھا، میرے ایک مغربی استاد نے بتایا کہ ایک صاحب مغرب (مراکش) میں فقہ مالکی پر کتاب لکھ رہے تھے۔ ان کا روزانہ کا یہ معمول تھا کہ دو پہر کو وہ گھر جاتے تھے، اور کھانا کھاتے تھے، اور آ جاتے تھے، ایک دن وہ گھر نہیں گئے تو لوگوں نے کہا کہ آج آپ کھانے پر تشریف نہیں لائے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، میں تو آیا تھا، میں نے کھانا بھی کھایا! اب ان کو فکر ہوئی کہ کیا بات ہوئی، معلوم ہوا کہ مسئلہ سوچتے ہوئے نکلے اور ایک گھر کا دروازہ کھلا تھا، اس میں چلے گئے اور وہ لوگ اتنے مثقف اور مہذب تھے کہ انہوں نے کھانا کھلایا اور ان کو بالکل محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کا گھر نہیں ہے، اس زمانے میں علماء کی قدر تھی، ان کو شاید معلوم تھا کہ وہ اس وقت نکلتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں، گھر والوں نے دستر خوان بچھایا، ہاتھ دھلائے، انہوں نے کھانا کھایا، ہاتھ پونچھے، اور اپنی جگہ آ گئے، اور یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے گھر گئے تھے اور کھانا کھایا تھا۔

ایک واقعہ امام غزالی نے غالباً "احیاء العلوم" میں لکھا ہے، کہ امام شافعیؒ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ کے گھر آئے۔ امام صاحب کے بچے کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے تھے کہ ہمارے والد ہر نماز کے بعد امام شافعیؒ کے لیے دعا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ "اے اللہ! محمد بن ادریس کو زندہ رکھ، قائم رکھ، ان کی عمر میں برکت دے" وہ بچے سوچتے تھے کہ ہمارے باپ امام وقت ہیں، ان کے استاد کیسے ہوں گے جن کے لیے یہ دعا کرتے ہیں؟ تو ایک مرتبہ پوچھا کہ ابا جان آپ کس کے لیے دعا کرتے ہیں اور کیوں؟ انہوں نے کہا "بابنی! إِنَّهُ كَالشَّمْسِ لِلدُّنْيَا وَالْعَافِيَةِ لِلْبَدَنِ" ایک مرتبہ لطیفہ یہ پیش آیا کہ امام شافعیؒ تشریف لے آئے، تو گھر والوں نے سمجھا کہ گھر بیٹھے دولت ملی، بڑی خاطر مدارات کی اور رات کو جب وہ کھانا کھا کے اور باتیں کر کے بستر پر لیٹے، تو بچوں نے سوچا کہ والد صاحب بڑا وقت عبادت میں گزارتے ہیں، یہ تو ہمارے والد کے بھی استاد ہیں، ان کی تو پلک بھی نہیں لگے گی، رات بھر عبادت کریں گے، چنانچہ انہوں نے لوٹا بھر کر رکھ دیا کہ رات کو اٹھیں گے، وضو کریں گے، عبادت میں مشغول ہو جائیں گے، لیکن وہ صبح تک سوتے رہے، یہاں تک کہ امام احمد بن حنبلؒ آئے اور

انہوں نے اٹھا دیا، وہ اٹھے اور بے وضو کیے ہی نماز پڑھنے چلے گئے، اب تو ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ یا اللہ! قصہ کیا ہے؟ لوٹا دیکھا تو ویسا کا ویسا بھرا رکھا ہے، بڑی حیرت کہ انہوں نے بے وضو نماز پڑھ لی، اس زمانے میں اعتراض کرنے کا رواج نہیں تھا، جب وہ مجلس میں آکر بیٹھے تو امام احمد بن حنبل سے امام شافعی نے کہا کہ ابوعبداللہ! رات کو عجیب واقعہ پیش آیا، جب تم مجھے لٹا کر گئے تو فلاں حدیث کی طرف ذہن چلا گیا، میں نے اس سے مسائل استنباط کرنے شروع کیے، رات بھر مسائل استنباط کرتا رہا، مسائل کی ایک بڑی تعداد بیان کرکے فرمایا کہ اتنے مسائل استنباط کر چکا تھا کہ صبح ہوگئی، اسی پر شاعر نے کہا ہے۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

ذرا جذ کرنی کا دور دورہ ہو تو اخبار میں چھاپ دیا جاتا کہ ایسے ایسے علماء ہیں جو بے وضو نماز پڑھ لیتے ہیں، بلکہ پڑھا بھی دیتے ہیں (تعجب نہیں کہ انہوں نے نماز پڑھائی بھی ہو، بھلا ان کی موجودگی میں کون نماز پڑھاتا)۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اس خلا کو پُر فرمادے۔(1)

(۱) مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن (کراچی) میں ۱۳ ر جولائی ۱۹۷۸ء کو طلبہ کے سامنے کی گئی ایک اہم تقریر سے ماخوذ از "مجموعہ فکر و عمل" صفحہ ۲۸۳ تا ۲۹۴۔

دوسرے اقتصادی فلسفے بھی ہیں، لیکن سب کا منتہیٰ اور "نقطۂ جامعہ"، قدر مشترک (Common Factor)، مادیت ہے، نفس پرستی ہے۔

وہ حقائق جو مادیت پر ضرب کاری لگاتے ہیں

جب انسان اپنے پیٹ کا، اپنے معدے کا غلام تھا، اپنے اندرونی سفلی خواہشات کا غلام تھا، جب انسان دولت، عورت، زمین کے سوا کسی کو حقیقی نہیں مانتا تھا، جب دنیا کی کثیر آبادی مخلوق کے سامنے جھکتی تھی، اور اس کے سامنے دبتی تھی، انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے دور میں تشریف لائے اور انہوں نے بتایا کہ اس عالم سے ماوراء ایک عالم ہے، وہ عالم اس عالم سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ رنگین، کہیں زیادہ حسین اور جمیل ہے، اس عالم کو اگر تم دیکھ لو تو اس عالم کو گوارا کرنا مشکل ہوگا، اس عالم میں زندگی گزارنا ایسا ہوگا جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا جائے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، جیسے کسی آزاد پرندے کو کسی پنجرے میں بند کر دیا جائے اور وہ پنجرا بھی بہت تنگ ہو، وہ پھڑ پھڑانے لگتا ہے، اسی طریقہ سے اگر تم اس عالم کو دیکھ لو تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں اور تم کو اس دنیا سے گھن آنے لگے، جس دنیا کو تم سب کچھ سمجھ رہے ہو، جس دنیا پر تم اپنی عزیز متاع، روحانیت کی، علم کی، اخلاق کی قربان کر رہے ہو، اس عالم سے تمہیں گھن آنے لگے، جس طرح کسی کو ایک مدت کے لیے گندگی کے کسی بہت بڑے ذخیرے پر کھڑا کر دیا جائے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اور اس کو متلی آنے لگتی ہے، یہ وہ چیز ہے، جو قرآن نے صحف سماوی نے اپنے اپنے طرز پر بیان کی ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ﴾ [سورۃ النساء: ۷۷]، کہیں حطام کے لفظ سے اس کی تعبیر کی، کہیں زروع کے لفظ سے ادا کیا، یہ حطام ہے، یعنی چورا ہے، جیسے کھیتی کا چورا ہوتا ہے ویسے ہی یہ بھوسا ہے، کہیں ﴿كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ﴾ [سورۃ الفتح: ۲۹] کسان کی کھیتی لہلہائی تو اس کو بڑی بھلی لگی اور اس کی رال ٹپکنے لگی، اور اس نے کہا کہ کیسا اچھا یہ چمن ہے جو کھلا ہے، کیسی یہ کھیتی ہے، پھر تھوڑی دیر کے بعد خزاں کا ایک جھونکا چلا، یا کسان کی درانتی اس پر چلی تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

سب سے پہلے اللہ کے پیغمبروں نے دنیا کی یہ حقیقت منکشف کی کہ دنیا بچوں کا کھیل ہے، جیسے ریت پر بیٹھے وہ گھر بناتے ہیں، محل بناتے ہیں، گھروندے بناتے ہیں، پھر اپنے ہاتھ سے توڑ دیتے ہیں، پھر بناتے ہیں، تو خوش ہوتے ہیں، اور پھر خود ہی توڑ دیتے ہیں، بازیچۂ اطفال ہے، یہ دنیا ان عقلاء کے سامنے، عارفین کے سامنے اللہ نے یہ حقیقت منکشف کی، اگر آپ تاریخ پڑھیں تو آپ کو یہ سب کچھ نظر آجائے گا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

بغداد میں ایک مرتبہ ہم نے ایک میوزیم دیکھا جو ماقبل تاریخ کے مختلف تمدنوں، مختلف تہذیبوں، وادی فرات کی تہذیبیں، نمرود وغیرہ کا زمانہ اور نہ معلوم کون کون سی سلطنتوں کے آثار تاریخی یادگار کے طور پر سجائے رکھے ہیں، پھر اس کے بعد تاریخ کا سفر کرتے کرتے عہد عباسی، اس کے بعد سلجوقیوں کا زمانہ، تاتاریوں کا زمانہ اور مغلوں کا زمانہ، ترکوں کا زمانہ، انگریزوں کا زمانہ، فیصل بن حسین کا زمانہ سامنے آیا، آپ یقین کیجیے، اتنے دیر میں مجھے دنیا کے تغیر و تبدل سے متلی آنے لگی، جیسے کوئی کڑوی چیز کھائے یا کوئی اوورڈوز (Overdose) ہو جائے، میں تھک گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب تماشا ہی تماشا ہے، یہ وہ سلطنتیں ہیں جن کو زوال کی منزل طے کرنے میں اور ختم کرنے میں ہزار سال، کسی کو پانچ سو برس لگے ہیں، مگر ہم کو یہ معلوم ہونے لگا کہ گھنٹوں کا معاملہ ہے، جو کچھ دھوکہ تھا، یا خواب تھا، جن کو لوگ سمجھے ایک ہزار برس تھا، ہم نے ان کا انجام دیکھ لیا، ہم ایسی جگہ کھڑے ہیں جہاں انسانیت کا ملبہ ہے، اور ملبے پر کھڑے ہیں، ایسے ہی ہمارے بعد جو لوگ آئیں گے، اور وہ بھی دیکھیں گے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ہم جس کو طویل سمجھ رہے ہیں وہ کتنا قلیل ہے۔

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے

خدا کو اس دنیا کو آباد رکھنا ہے، اس لیے خدا نے یہ دنیا عام انسانوں پر ایسی منکشف نہیں

خوش ہو رہے ہو، ہم آئے ہیں تاکہ تم کو آزادی دلائیں، یہ مسلمان کی اس وقت کی نظر تھی، اور یہ اس وقت کے علمائے ربانی تھے، لوگ ان کے پاس جا کر روحانیت کا علاج کراتے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی بلا میں مبتلا ہیں، اور یہ لوگ کیسا عیش کر رہے ہیں، اور کسی جنت میں رہ رہے ہیں، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا مقولہ ہے "الجنة في صدري" میری جنت میرے سینے کے اندر ہے، اس لیے کہ ان کو اللہ پر بھروسا تھا، وہ کسی چیز سے ڈرتے نہیں تھے، ہر وقت شکر کا غلبہ تھا، نماز میں ان کو لذت اور دعا میں ان کو حلاوت محسوس ہوتی تھی، اور ہر وقت تو جنت میں لوٹتے پوٹتے رہتے تھے، دیکھنے والے دیکھتے تھے وہ دنیا میں ہیں، لیکن حقیقت میں جنت الفردوس میں تھے، اور ایک مرتبہ جوش میں آ کر کہا کہ لوگ میرا کیا لے لیں گے، مجھ سے کیا چھین کر لے جائیں گے، میرے عیش کا سامان تو میرے دل کے اندر ہے، اس کو کون نکال سکتا ہے، بعض عارفوں کا قول سنا ہے کہ خدا کی قسم! اگر دنیا والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم کس عیش میں، کس مزے میں ہیں، تو ہم کو بیٹھنے نہ دیں، تلواریں لے کر جس طرح ملکوں پر حملہ کرتے ہیں، اسی طرح ہم پر حملہ کریں اور تھوڑی سی جگہ جو ہم نے بنائی ہے، ایک گوشہ میں یا مسجد کے کونے میں، ہمیں یہاں بھی بیٹھنے نہ دیں، سمجھیں کہ یہاں کوئی خزانہ گڑا ہوا ہے، یہ جو زمین پر بچھا کر بیٹھا ہے، اتنا مطمئن ہے کہ اس کو نہ بھوک معلوم ہوتی ہے اور نہ پیاس معلوم ہوتی ہے، اس کی جائے نماز کے نیچے ایک سوتا ہے، کشش ہے، جہاں سے رزق ملتا ہے، جہاں سے فرحت ملتی ہے، تو وہ ہمیں اٹھا دیں اس مصلے سے، اور ہم سے کہیں کہ جنگل کی راہ لو اور جا کر وہاں خدا الٰہی کریں جیسے ہر دل کی خدائی ہوتی ہے۔

قناعت کا جوہر

حضرات! اس چیز کا مقابلہ وہ علماء کر سکتے ہیں، جن کے اندر قناعت کا جوہر ہو، جو کسی دام میں نہ تو آ سکیں اور کہیں۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

جاؤ کسی اور کو تلاش کرو، ہم بکنے والے نہیں ہیں، ہم سکوں کے عوض یا تمہارے عہدوں کے

حکمت سے مراد اخلاق

تزکیہ کے بغیر تعلیم کتاب وحکمت ناقص

لذیذ کھانا کھا سکتے ہیں تو خواہ مخواہ اس کو بے لذت نہ بنائیں، جیسے بعض بعض غالی صوفیوں کے متعلق سنا کہ سالن میں پانی اوپر سے ڈال دیا تاکہ بے مزہ ہو جائے، پڑوسیوں میں تقسیم کرنے کے لیے نہیں بلکہ بے لذت بنانے کے لیے، یا بہت سا نمک ڈال دیا، یا بے نمک کے کھا رہے ہیں، تاکہ کوئی لذت حاصل نہ ہو، یہ تزکیہ اسلام کا تزکیہ نہیں، شریعت اس کی ہمت افزائی نہیں کرتی، آپ کو اگر متوسط درجہ کا خوش ذائقہ کھانا میسر ہے تو ضرور اللہ کا شکر ادا کریں، اور ہر ہر لقمہ پر شکر کریں، لیکن ہوس اور ہل من مزید، یہ جو آج ہر طبقہ میں آگئی ہے، مرتبہ کی کوئی مقدار، عزت کی کوئی مقدار اس کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، اور ہل من مزید کا نعرہ بلند ہوتا ہے، علماء اس سے بالکل ممتاز، ممیز اور نمایاں ہوں۔

چند بوریہ نشینوں کی ضرورت

آج پاکستان کو بچانے کے لیے جہاں اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے، جن کو کراچی سے اسلام آباد تک اور اسلام آباد سے فیصل آباد تک کہتا چلا آرہا ہوں، ان میں ایک بڑا عنصر اور ایک بہت بڑی طاقت علماء کی زاہدانہ قناعت والی اور خودداری والی زندگی ہے، علماء ایسی زندگی کا نمونہ پیش کریں کہ یہ معلوم ہو کہ یہ کسی اور ہی طبقہ کے لوگ ہیں، یہ وراثت انبیاء کے وارث ہیں، یہ نائبین انبیاء ہیں، یہ مادیت کے زخم خوردہ اور اس کے مقتول و شہید نہیں، جن کے پاس جاکر دنیا کی بے حقیقتی ظاہر ہو، اور جن سے ہم یہ معلوم ہو کہ دولت ہی سب کچھ نہیں، جس کو سروکار غرض ہو وہ یہاں آئے، ہم کسی کے دروازے پر نہیں جاتے، اگر جاتے ہیں تو دین کی دعوت لے کر جاتے ہیں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے جائیں گے، کسی فریضہ، کسی سنت کے احیاء کے لیے جائیں گے، اپنی غرض کے لیے، کسی کی سفارش کے لیے نہیں جائیں گے۔

اس خلا کو کوئی چیز پر نہیں کر سکتی

یہ پاکستان کی شدید ترین ضرورت ہے، اس خلا کو کوئی اور چیز پر نہیں کر سکتی، تصنیف، تالیف، خطابت، تحقیق، سیاست، تحریک، کوئی چیز اس کمی کو پر نہیں کر سکتی، یہاں کچھ آدمی ایسے پائے جائیں جن کے پاس طاقت والے، سیاست والے آنے پر مجبور ہوں، ذرا پیچھے اور دل

عصر حاضر کا جدید چیلنج

اور علماء و اہل مدارس کی ذمہ داریاں

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ أجمعین، ومن تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلی یوم الدین.

یہ ناچیز اپنی اور اپنے رفقائے کار کی طرف سے حضرات ارکان انتظامی کا، جو اپنا قیمتی وقت نکال کر اور سفر کی زحمت برداشت کرکے اس مجلس انتظامی میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں، خیر مقدم کرتا ہے۔ اس چیدہ اور ممتاز و منتخب مجمع کو دیکھ کر آپ سے اجازت چاہوں گا کہ اس ادارہ کے انتظامی امور اور مشورہ اور فیصلہ طلب انتظامی و تعلیمی معاملات کے محدود دائرہ سے ذرا ہٹ کر ان حقائق اور حالات کی طرف بھی اشارہ کروں، اور آپ کی توجہ منعطف کراؤں جو اس ادارہ کے گرد و پیش اور محل و مقام ہی نہیں، ملک و ملت کو بھی درپیش ہیں، اور ان سب پر اثر انداز، اور کوئی ادارہ، تحریک، تنظیم اور کوئی اکائی (Unit) یا معاشرہ (Society) حتیٰ کہ دین و ملت بھی ان خارجی اثرات، عوامل، طاقات، خطرات و تحدیات (Challenges) سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے۔

اسلام کے قلعے

حضرات! ہمارے اسلاف کرام اور اپنے وقت کے علمائے عظام نے دین کی تعلیم کے

جو ادارے (مدارس دینیہ عربیہ) قائم کیے تھے، وہ دراصل اپنے اپنے وقت پر اور اپنی اپنی جگہ پر اسلام کے قلعے تھے، اور ان کو انہیں لفظوں اور اسی تعبیر سے یاد کرنا چاہیے۔(1)

دین کے ایک نقطے سے بھی دستبردار نہیں ہونا ہے

ان بالغ نظر اور موفق من اللہ بانیان و موسسین مدارس نے (جن میں سرفہرست اور نمایاں تر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ہیں) اپنی پیش بینی بلکہ فراست ایمانی، اپنے راسخ علم اور گہرے مطالعہ، قوت مشاہدہ اور قیاس و استنتاج کی ذہنی صلاحیت سے اپنے ملک و مقام بلکہ گردوپیش کی دنیا اور دور و زوال زمانے اور تاریخ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ نہ صرف انقلاب سلطنت بلکہ تمدن و تہذیب، تعلیم و ثقافت کی تبدیلی اور سیاسی و اقتصادی عوامل کے اثر سے ملت کی نئی نسل کو ذہنی و فکری ارتداد بلکہ (خاکم بدہن) دینی و ایمانی ارتداد، انحراف ہی نہیں بلکہ تحریف، اور دینی حمیت ہی نہیں بلکہ دین و ملت سے انتساب تک سے تبری اور شرمندگی، بلکہ جبر و اعلان سے بچانے کے لیے ایسے مراکز کی ضرورت ہے جہاں علم راسخ اور ایمان راسخ، بلکہ اس پر فخر و شکر، اور دین پر ثبات و استقامت ہی نہیں بلکہ اس کی اشاعت و دعوت و تبلیغ کا مزاج پیدا ہو، اور جہاں ملی تشخص اور شریعت پر (عقائد و اصول سے لے کر تہذیب و معاشرت اور عائلی زندگی و قانون تک) ان میں استقامت ہی نہیں بلکہ غیرت و حمیت اور فخر و شکر ہو، اور وہ دین کے ایک نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوں۔

ایک تاریخی حقیقت

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا تعلق کسی جماعتی عصبیت اور تعلق سے نہیں کہ ان

(1) نامناسب نہ ہوگا اگر یہ ذکر کر دیا جائے کہ ندوۃ العلماء کے ترجمان رسالہ "الندوۃ" کے دور سوم میں جو مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ادارت اور حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی سرپرستی میں نکلنا شروع ہوا تھا، راقم سطور کے قلم سے اسی عنوان "اسلام کے قلعے" پر ایک سلسلہ مضامین شروع ہوا تھا، جو متعدد اقساط میں آیا تھا۔

فضلائے مدارس نے یہ فرض (علی حسب مراتب وتوفیق) کامیابی سے انجام دیا، اور ان کی وجہ سے ابھی تک اس برصغیر ہند میں بڑی حد تک ملی تشخص اور اعتقادی، فکری، تہذیبی اور اخلاقی امتیاز پایا جاتا ہے، اور بڑی بات یہ ہے کہ ایک بڑے دائرہ میں اس کے عقائد محفوظ ہیں، دین کے فرائض وارکان زندہ ہیں، مسجدیں آباد ہیں، اور مرکز اسلام جزیرۃ العرب اور حرمین مقدسین سے حج وعمرہ کے ذریعہ، محبت وعقیدت کے ذریعہ (اور ایک خاص دائرہ میں) عربی زبان اور علوم دینیہ کے ذریعہ رابطہ قائم ہے۔

ان دینی قائدین، اہل غیرت وحمیت مسلمانوں اور علماء دینی رہنماؤں نے اپنے اس دینی جذبہ، ملی غیرت، اور دینی فراست اور پیش بینی کو ہندوستان ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس سے عالم اسلام کے وسیع دائرہ میں بھی کام لیا، اس سلسلہ میں تحریک خلافت، ترکوں کی حمایت اور جزیرۃ العرب کے تقدس کی حفاظت تک ان کی سعی، دلچسپی اور سرگرمی محدود نہیں تھی، اس کا تفصیل سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس کی تاریخ بہت کچھ محفوظ ہے، اور جو حضرات یہاں تشریف رکھتے ہیں ان میں سے بہت سے اس کے شاہد عینی اور معاصر رہ چکے ہیں، اور بہت سے حضرات نے اس کو علی سبیل التواتر سنا ہے اور وہ اس کی طاقت وہمہ گیری سے واقف ہیں۔

علمی حملوں کا علمی جواب

لیکن یہ بات بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ نہیں ہوگی کہ ہندوستان کے علماء اور مدارس کے فضلاء نے علمی وفکری اور تصنیفی طور پر بھی ہندوستان اور بیرون ہند میں اٹھنے والے صلیبی حملوں اور تحریکی وانتشار انگیز لٹریچر کا ایسا مقابلہ کیا جس کا خالص مسلمان اکثریت کے ملکوں اور علمی ودینی مرکزوں میں بھی، جہاں صدیوں کی پرانی اور عالمگیر شہرت رکھنے والی جامعات اور تصنیفی مراکز قائم ہیں، اعتراف کیا گیا، اس سلسلے میں ہم ان نادرۂ روزگار تصنیفات کا ذکر نہیں کریں گے، جو ہندوستان کے اسلامی عہد میں وجود میں آئیں اور

فضلائے عرب بلکہ ائمہ فن نے بھی ان کی انفرادیت اور بے نظیری کا اعتراف کیا۔[1]

ان میں ایک حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی (متوفی ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء) کی بے نظیر کتاب "اظہار الحق"[2] ہے، جس میں اناجیل اور مذہب عیسوی پر ایسی ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے جو ریاضی کے نتائج کی طرح (کہ دو اور دو چار ہی ہوتے ہیں اور چار چوڑ آٹھ ہی ہوتے ہیں) اناجیل کے بیانات میں تضاد و تناقض ثابت کیا ہے، جن کا جواب ابھی تک مسیحی دنیا اور کلیسا کے فضلا نہیں دے سکے، راقم نے خود انگلستان سے نکلنے والے ایک انگریزی اخبار میں پڑھا کہ "جب تک اس کتاب کی طبع و اشاعت کا کام جاری رہے گا عیسائیت کی تبلیغ نہیں ہو سکتی"۔

دوسرا کارنامہ مولانا شبلی نعمانی کا ہے کہ جب مشہور مصری مسیحی فاضل مورخ و ادیب جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" نکلی، جس میں اسلامی تمدن پر ایسے غلط اور ساحرانہ مندانہ طریقہ پر حملے کیے گئے تھے جن سے پڑھنے والوں کا ذہن اسلام کے دین حق ہونے اور زندگی کا بہترین لائحہ عمل دینے کی صلاحیت سے محروم نظر آنے لگتا ہے، مولانا شبلی علیہ الرحمۃ نے اس کا بڑی قابلیت اور سائنٹفک طریقہ سے جواب دیا اور کتاب "الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی" کے نام سے شائع ہوئی، جس کی داد فضلائے عرب حتیٰ کہ علامہ سید رشید رضا مرحوم نے بھی دی۔

تقابلی مطالعہ

ان مدافعانہ اور جوابی علمی کوششوں کے علاوہ ہندوستان کے فضلاء اور محققین کے اور متعدد علمی کارنامے اور تحقیقی و تقابلی مطالعہ کے نمونے ہیں جن کی مثال عالم عربی میں بھی ملنی

(۱) اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم سطور کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئی (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی منفرد کتاب "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" مطبوعہ المجمع العلمی العربی، دمشق

(۲) یہ کتاب جب لکھی گئی اس وقت نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ عرب ممالک پر بھی مشنریوں کے حملے اور مسیحیت کی دعوت شروع ہو گئی تھی اور سلطنت ترکی بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھی، اس سلسلے میں پادری فنڈر بہت زیادہ سرگرم اور فعال تھا

مشکل ہے، ہم یہاں پر چند کتابوں کے نام پیش کرتے ہیں:۔

مولانا شبلی کی "الجزیة فی الاسلام"، مولانا سید سلیمان ندوی کی "خطبات مدراس" اور "ارض القرآن"، مولانا عبد الماجد دریابادی کی انگریزی اردو ترجمہ اور تفسیر جس میں جدید ترین معلومات و تحقیقات کی روشنی میں قرآن کا اعجاز اور صحف سماویہ پر تفوق ثابت کیا گیا ہے، ایسے ہی ان کی کتاب "مشکلات القرآن"، مولانا عبد الباری ندوی کی کتاب "مذہب و عقلیات" وغیرہ۔

مسلم ممالک میں الحاد و لادینیت کا مقابلہ

اب اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ علمائے ہند و فضلائے مدارس نے کبھی بیرونی اسلامی ممالک سے آنکھیں بند نہیں کیں، وہاں اٹھنے والے فتنوں، تخریبی حملوں اور الحاد و لادینیت اور "قومیت عربیہ" کی خطرناک اور بعید نتائج رکھنے والی مخالف اسلام دعوت کو نظر انداز نہیں کیا، اس سلسلے میں (معذرت کے ساتھ) لیکن ناگزیر اور ضرورتاً یہ عرض کیا جاتا ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے فرزندوں اور فضلاء نے ہمیشہ ان بیرونی فتنوں کا نوٹس لیا، جو مرکز اسلام میں اضطراب اور تزلزل پیدا کرنے والے بلکہ نصرانیت، یہودیت، الحاد و لادینیت کے لیے راستہ کھولنے والے تھے۔[1] اس سلسلے میں ندوے سے نکلنے والے رسالے "البعث الاسلامی" اور "الرائد" کو فراموش اور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جن سے سلیم الطبع، اسلام پسند عرب بڑے متاثر ہوئے ہیں، پھر مرحوم عزیز القدر محمد الحسنی کے رسائل اور کتابیں جن میں "الاسلام الممتحن" اور "الاسلام بین لا و نعم" خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن میں سے بعض کتابوں کو پڑھتے ہوئے راقم نے بعض عرب فضلاء اور قائدین کو اشکبار و دیدہ تر دیکھا ہے، اسی مقصد کے لیے مئی ۱۹۵۹ء میں "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" دار العلوم کے احاطہ میں قائم ہوئی، اور اس نے عربی، انگریزی، ہندی اور اردو میں وہ لٹریچر شائع کیا جو بہت مؤثر اور اسلام کے بارے میں غیر مسلموں تک کے دل میں وقعت و احترام

(۱) تفصیل اور دلائل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "عرب قوم پرستی اسلامی نقطۂ نظر سے خطرناک کیوں؟" شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

پیدا کرنے والا ثابت ہوا، ابھی حال میں خاکسار نے ان دعوتی رسائل و خطبات کا جائزہ لیا جو عربی میں لکھے گئے تھے تو ان کی تعداد بہتر (۷۲) نکلی، جن میں بہت سے ممالک عربیہ میں بھی شائع ہوئے ہیں، اور شوق سے پڑھے گئے ہیں۔

اسلام کے خلاف یہودی و مسیحی سازشیں

اب اس تاریخی جائزہ اور علمائے ہند اور فضلائے مدارس کی وسیع ذمہ داریوں اور کوششوں کے پس منظر اور روشنی میں مقتدر اراکین کی خدمت میں ان چند الحادی وارتدادی کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو مغرب میں اسلامی ممالک کو عموماً مت کے ساتھ اور ممالک عربیہ کو (جن کو قیامت تک لیے دین کا منبع اور ماوی بنایا گیا ہے) نہ صرف اسلامی و دینی حمیت وعزت سے محروم کرنے بلکہ اسلام سے انتساب تک کے منکر ہونے اور اس کی تحقیر و تذلیل کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے شروع کی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی حقیقت کا (جو انکشافات کا درجہ نہیں رکھتی بلکہ اب مشاہدہ اور حد تواتر تک پہنچ گئی ہے) ذکر کیا جاتا ہے، وَفِي ذَلِكَ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَبْصَارِ۔

واقعہ یہ ہے کہ یہودی دماغ اور ذکاوت (جس کو عربی میں شطارت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور مسیحی طاقت واقتدار اور وسائل اثرات، دونوں اس وقت اسلام کی بیخ کنی اور اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹی پانے کی کوشش میں ہمنوا اور مددساز بن گئے ہیں۔ (۱)

یہودی صدیوں پہلے سے دنیا کو شطرنج کی ایک ایسی بساط بنانا چاہتے ہیں جو بالکل ان کے قابو میں ہو اور جس مہرہ کو چاہیں وہ کہیں سے اٹھا کر کہیں رکھ سکیں، اور ان کی کتابوں صحف تلمود اور "پروتوکولات حکماء صہیون" میں اس کی تصریحات موجود ہیں، اور وہ اس مقصد کو اخلاقی پستی، بے ضمیری اور نفس پرستی پیدا کر کے بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے وہ فلسطین میں اسرائیل کی حکومت قائم کر کے اب مشترک و متحد طریقہ پر اس مقصد کے حصول میں شریک ہیں، یہاں پر صرف ایک امریکی

(۱) اس موضوع پر راقم نے ۲۰ ستمبر ۱۹۹۳ء کو مکہ معظمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے ایک موتمر نمائندہ جلسہ میں ایک مقالہ پڑھا تھا، جو قابل ملاحظہ ہے۔

ضرورت ہے کہ اب یہ ناپسندیدہ اثرات خلیج کی ریاستوں (کویت، بحرین، وغیرہ) اور کسی حد تک (خادم حرمین) سعودی عرب میں بھی پہنچ رہے ہیں۔

دوسرا محاذ جس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے فضلاء کو تیار ہونا اور رہنا چاہیے، وہ ہندو احیائیت (Hindu Revivalism) کی زبردست تحریک ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ مختصر لفظوں میں اس ملک کو اسپین بنا دیا جائے، جہاں صرف نسلی حیثیت سے مسلمان رہیں، باقی ان کی تہذیب، معاشرت اور عائلی قانون، اور ہو سکے تو اعتقادی سرچشمہ بھی بدل دیا جائے، اور وہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر ہندو دیومالا (Hindu Mythology) کو قبول کرلیں، اس کے لیے نصاب تعلیم، ذرائع ابلاغ اور سیاسی اثرات سے بھی کام لیا جا رہا ہے، اور اس کے اثرات بھی نظر آنے لگے ہیں۔

پہلے پرسنل لا میں مداخلت کے لیے اقدام کیا گیا تھا، اور بعض خلاف شرع اور منافی شرع عدالتی فیصلے کیے گئے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ مولانا سید منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار وفرزند مولانا سید محمد علی مونگیری) کے درجے بلند فرمائے کہ انہوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ قائم کرکے اور ایک ہمہ گیر مہم چلا کر اس خطرہ کا فی الحال سد باب کر دیا، لیکن ابھی حال میں یونیفارم سول کوڈ کا شگوفہ چھوڑا گیا، خدا کا شکر ہے کہ اس کی بھی ملت اسلامیہ ہندیہ نے بالعموم اجتماعی طور پر مخالفت کی، اور امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ عمل میں نہ آسکے گا۔

ان سب حقائق، واقعات، خطرات اور اندیشوں کو سامنے رکھ کر آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے مدارس عربیہ دینیہ میں ان حقائق کو سمجھنے اور ان کے فضلاء کو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار اور سرگرم بنانے کی ضرورت ہے، ندوۃ العلماء نے (جو انہیں حقائق وخطرات کے شعور و فکر اور ان کا مقابلہ کرنے کے عزم کے نتیجہ میں وجود میں آیا) مجلس انتظامی میں جس میں منتخب و ممتاز علماء و دانشور شریک ہیں، پیش کرنے کی جرأت کی تھی، جس سے نئے معانی بھی پیدا ہو سکتی ہے اور توجہ و حسن استماع کا شکریہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔

وما النصر الا من عند اللہ۔ (۱)

---

(۱) ۱۶ صفر ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۹۹۵ء کو ندوۃ العلماء کے ارکان انتظامی کے جلسہ میں پیش کی گئی رپورٹ، ماخوذ از پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ جولائی ۱۹۹۵ء)۔

پیامِ راہ

حضرات اساتذہ، حاضرین مجلس و عزیز بھائیو!

جامعہ اسلامیہ میرے لیے کوئی نیا ادارہ نہیں ہے، میں پہلی مرتبہ یہاں نہیں آیا، شروع سے اس کے مشوروں میں شریک رہا ہوں، اور پہلا سفر بھی اسی سلسلہ میں ہوا تھا، ہمارے عزیز اور ہمارے دوست محی الدین صاحب منیری یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے میں شروع سے اس کام میں ذہنی طور پر قلبی طور پر شریک رہا، اور اس دوسری مرتبہ کی حاضری میں بھی اس کے معائنہ سے اور آپ لوگوں کی ملاقات سے محروم نہیں رہا، آپ سب جانتے ہیں کہ یہ کوئی وعظ کا جلسہ نہیں ہے، مجھے، جب سے آیا ہوں، کئی بار اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں عرض کرنے کا موقع ملا اور ایک دو بار شاید اور موقع ملے، اس وقت اور باتیں بھی ہوں گی، لیکن اس وقت عام باتیں کہی جائیں گی، یہاں مجھ سے یہ امید کی جاتی ہے بجا طور پر کہ میں اس وقت اپنے اس جامعہ کے مدرسین، اساتذہ اور یہاں کے طلبہ سے کچھ کہوں، اور میرے لیے یہ بات آسان بھی ہے اور خوشگوار بھی، اس لیے کہ میں خود بھی ایک مدرسہ کا پڑھا ہوا ہوں، اور ایک مدرسہ میں عرصہ تک میں نے پڑھایا ہے، اور میری زندگی ایک مدرس کی زندگی ہے، اس لیے مجھے آپ لوگوں سے بات کرنے میں کوئی تکلف نہ کرنا پڑے گا، کوئی بہت دور کی کوڑی لانی نہیں پڑے گی، بہت زیادہ دماغ پر زور دینا نہیں پڑے گا۔

امیدوں کا مرکز

بھائیو! تم لوگ بہت سی امیدوں کا مرکز ہو، اور یہاں کے مسلمانوں نے اور تمہارے سرپرستوں نے اور اس جامعہ کے کارکنوں اور اس جامعہ کے سرپرستوں نے تم سے بہت سی

امیدیں قائم کی ہیں، اور ایسا کرنا بھی چاہیے تھا، اس لیے کہ مسلمان خواہ کچھ بھی ہو جائیں، بہت بڑے تاجر، بہت بڑے کاروباری، بہت بڑے دولت مند، سرمایہ دار اور حکومت میں شریک ہو جائیں، اور ملک کی ذمہ داری میں بھی ان کا بڑا حصہ ہو جائے، جب بھی مسلمانوں کو بہرحال دینی رہنماؤں کی ضرورت ہوگی، حرام وحلال، کفر وایمان، جائز وناجائز، اور دین اور لادینیت کے درمیان لکیر کھینچنے والوں کی ضرورت ہوگی، جو لکیر کھینچ کر بتا سکیں کہ یہ کفر ہے، یہ ایمان ہے، یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، یہ دین ہے، یہ لادینیت ہے، یہ اسلام ہے، یہ جاہلیت ہے، مسلمان کسی دور میں اور کسی ملک میں، کسی حال میں بھی ایسی جماعت سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

کوئی گروہ رہنمائی کے بغیر اپنا سفر طے نہیں کر سکتا

سمجھا یہ جاتا ہے کہ تم ان لوگوں کی جگہ لوگے جن کا فرض رہنمائی ہے، مسلمانوں کی رہنمائی کا لفظ بہت بڑا ہے، لیکن بہرحال ہر جماعت کو رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، کوئی گلہ جانوروں کا ہو اور کوئی گروہ انسانوں کا ہو، رہنمائی کے بغیر اپنا سفر طے نہیں کر سکتا، اپنی منزل مقصود کو پہنچ نہیں سکتا، اور کسی نظام میں باقی نہیں رہ سکتا، جس طریقے سے ہماری غذائی ضروریات ہیں، ہماری شہری ضروریات ہیں، تمدنی ضروریات ہیں، اور سیاسی ضروریات ہیں، قبلہ نما کی ضرورت، واقعہ یہ ہے کہ سب ضروریات سے زیادہ ہماری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہمیں کوئی یہ بتانے والا ہو کہ ہم ٹھیک راستہ پر چل رہے ہیں یا نہیں: "کیں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است" ایسا تو نہیں ہے کہ ہم پشت بقبلہ یعنی ہماری پیٹھ قبلہ کی طرف ہو، اور ہمارا رخ بت خانہ کی طرف ہو، یا معاذ اللہ کلیسا کی طرف ہو، بینک کی طرف ہو، کہ یہ بھی ایک کلیسا ہے اس زمانے کا، یا کسی کارخانہ یا فیکٹری کی طرف ہو، آج کل کلیساؤں میں وہ رونق نہیں ہے اور مندروں میں وہ چہل پہل نہیں ہے جو بینکوں اور کاروباری مراکز میں ہے، یہ بھی زمانہ کی بہت بڑی پرستش گاہ بن گئی ہے، کوئی جماعت ایسی ہونی چاہیے جو دانائی اور حکمت کے ساتھ بتائے، مہربانی اور محبت کے ساتھ بتائے، اور پھر اگر ضرورت ہو تو دامن بھی کھینچ لے، دامن پکڑ لے، اور گریبان بھی اگر پکڑنے کی ضرورت ہو تو جس طریقے سے باپ بیٹے کا گریبان

پکڑتا ہے، اور ایک پڑھا لکھا، ایک جاہل بھی گریبان پکڑتا ہے، ایک بھائی دوسرے بھائی کا گریبان تھام لیتا ہے، اس طریقہ سے ایک ایسی جماعت کو سامنے آجانا چاہیے، راستہ روک کر کھڑا ہونا چاہیے کہ یہ راستہ خطرناک ہے، یہ اللہ سے اور اس کے رسول سے دور کرتا ہے، یہ ہلاکت ابدی میں گرا دے گا، اور یہ غار کے اندر ڈال دے گا۔

مدارس کا اصل فائدہ

تو اس کے لیے ضرورت ہے مدارس کی، اور مدارس کا اصل فائدہ یہی ہے کہ ایسے لوگ تیار ہوں جو مسلمانوں کی دینی رہنمائی کر سکیں، اور وہ تو جیسے قبلہ نما ہوتا ہے، در قبلہ نما ایک سیدھی سی چیز ہے، آندھی چل رہی ہو، یا پانی برس رہا ہو، گاڑی کسی رخ پر جا رہی ہو، آدمی کا منھ کسی طرف ہو، لیکن قبلہ نما یا قطب نما کو دیکھیے، وہ قطب نما قطب تارہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے، وہ نہ کوئی رشوت قبول کرتا ہے، اور نہ کسی کی رعایت کرتا ہے، اور نہ کسی سے متاثر ہوتا ہے، اور نہ اپنے کام سے تھکتا ہے، اور اس سے کسی اور کام کی امید بھی نہیں کرنی چاہیے، زیادتی ہے اس کے ساتھ بھی، اپنے ساتھ بھی، کہ آپ اس سے نہیں راستہ پوچھیں، یا جیسے ٹرافک کنٹرول کرنے والا سپاہی ہوتا ہے، وہ کسی کو پانی پلانے لگے، یہ نہ جائے تو کوئی گناہ نہیں، وہ کسی کو راستہ بتانے کے لیے کچھ دور نہ چلے تو کوئی قصور نہیں، اس کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہے، بس ٹرافک کنٹرول کرتا رہے، وہ کہیں نہ کہیں ہاتھ ادھر کرے اُدھر کرے، اگر وہ اپنا کام چھوڑ دے گا تو مسافر کے بھٹک جانے سے زیادہ نقصان پہنچے گا، راستہ بھول جائے تو مسافر کچھ دور نکل جائے گا، لیکن یہاں پر کاریں ٹکرا جائیں گی، یہاں ٹرک اور جیپ میں اور کار میں ٹکر ہو جائے گی، اور معلوم نہیں کتنے آدمی اسی وقت اسی جگہ جان توڑ دیں گے۔

مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ جگہ پر رہیں، بے نیاز، مردود جہاں سے مخلص اور دل سے بے نیاز، بس ایک ہی کام ہے اس کا کہ یہ راستہ لے جاتا ہے، جنت اللہ کو جاتا ہے اور یہ راستہ جہنم کو جاتا ہے، اسی کے لیے مدارس قائم کیے گئے ہیں۔

عربی زبان کی اہمیت

اور چونکہ یہ بات خاص طریقے سے علوم اور ایک خاص زبان عربی کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتی تھی، اس لیے عربی پر زور دیا گیا، اور ان علوم کو نصاب میں رکھا گیا، ورنہ عربی ہماری زبان نہیں ہے اور ہم ہندوستانی مسلمان بہت بڑے نرغہ میں ہیں، زبانوں کے ایک ایسے چکر میں کہ شاید ہی دنیا کی کوئی قوم اس میں مبتلا ہو، یعنی ہم کو علاقائی زبان پڑھنی ہے، اور مادری زبان پڑھنی ہے، اور آپ کی مادری زبان تاملی ہے، اور آپ کی علاقائی زبان کنڑی ہے، اور آپ کی مذہبی زبان عربی ہے، اور آپ کی ہندوستان کی ملکی زبان اور اخبارات اور رسائل کی زبان، تصنیف و تالیف کی زبان اردو ہے، فارسی کا نام میں نہیں لیتا، ورنہ اب اس کا مسئلہ دور ہو گیا ہے، یہ چار پانچ زبانیں ہیں، ایسی حالت میں عربی زبان پر زور دینا اور عربی کو ایسے سمجھنا جیسا کہ اہل زبان سمجھتے ہیں تاکہ آپ قرآن مجید اور کتاب و سنت کی چیزوں کو آپ اچھی طرح گہرائی سے سمجھ سکیں، اس لیے یہ مشکل کام اختیار کیا گیا کہ آپ کو جو کام کرنا ہے وہ اس کے بغیر ہو نہیں سکتا، تو اس لیے عربی زبان پر زور دینے کی ضرورت ہے، اور عربی زبان کے لیے صرف و نحو کی ضرورت ہے، اس کے لیے آپ کو محنت کی ضرورت ہے، اور عربی ہمارے لیے کوئی نئی یا نامانوس نہیں، عربی زبان ہمارے ہندوستان میں بہت بڑی زبان رہی ہے، علمی زبان اور تصنیفی زبان رہی ہے۔

آپ کو عربی سے بڑی مناسبت ہے

خود آپ کے علاقے میں ایسے بہت سے لوگ پیدا ہوئے ہیں، ان کی کتابیں یہاں اہل علم کے پاس ہیں، ہمارے پرانے دوست اور محترم جناب خواجہ بہاء الدین صاحب اکرمی ندوی ان کے یہاں اچھا خاصہ ذخیرہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نائط اور یہ جو ساحلی علاقہ تھا، اس میں بڑے بڑے چوٹی کے علماء پیدا ہوئے، اور بڑی عالمانہ ہی نہیں بلکہ تحقیقی کتابیں لکھی ہیں کہ اہل عرب بھی ان کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں اگر وہ چھپیں، ان لوگوں نے محنت کی تو ان کو زبان پر ایسا عبور ہو گیا جیسے زبان والوں کو ہوتا ہے، اور میں دیکھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو زبان کے اخذ کرنے میں بڑی کامیابی ہوتی ہے، آپ کی زبان بہت نرم ہے، اور اردو

آپ بہت جلد سیکھ لیتے ہیں، اور آپ کی اردو بولنے میں وہ بات نہیں ہے جو ہندوستان کے بعض علاقوں کے رہنے والوں کی زبان میں، وہ لفظ بولتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اہل زبان نہیں ہیں، یہ بات آپ میں نہیں ہے، آپ کی زبان میں سالوچ ہے، کیوں ہے؟ یہ میں نہیں جانتا، ماہر نفسیات جانیں، آپ کی زبان میں لوچ ہے، ایسے ہی آپ کو عربی سے بڑی مناسبت ہے، اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ آپ عربی النسل ہیں، تو اس لیے بھی آپ کے عربی کے اخذ کر لینے میں اور عربی زبان میں کمال پیدا کر لینے میں کچھ دقت نہیں ہے۔

منزل آپ ہیں

بھائی! بڑی امیدوں اور توقعات کے ساتھ یہ جامعہ قائم کیا گیا، مجھے افسوس ہے کہ آج دو تین سال کے بعد میں آیا ہوں تو مجھے جو امید تھی کہ جہاں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا، وہاں بڑی بڑی عمارتیں تو دو چار عمارتیں ضرور کھڑی ہوں گی، بھٹکل والے جہاں جائیے وہاں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بعض کاروبار بالکل بھٹکلی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، کالی کٹ جائیے تو ان کے ہوٹل اور کپڑے کی دوکانیں، بمبئی جائیے تو وہاں، مدراس جائیے تو وہاں، کلکتہ جائیے تو وہاں، ایسی حالت میں تو ان کو واقعی جامعہ بنا رہنا چاہیے تھا، میں نہیں سمجھ سکا کہ یہاں کیا رکاوٹ ہے، اس میں کیا جامعہ کے ذمہ داروں کی طرف سے کچھ سستی اور کمزوری ہے، یہ تو مجھے کہتے ہوئے ذرا تامل ہوتا ہے اس لیے کہ منیری صاحب کی مستعدی تو میں جانتا ہوں اور وہ کتنے سب سے بڑے مخلص آدمی ہیں، یا یہ کہ ان لوگوں کو ذوق نہیں ہے، بہرحال جو وجہ بھی ہو، لیکن مجھے افسوس ہوا کہ اس وقت تک بھی جامعہ کو جس منزل پر دیکھنا چاہتا تھا وہ منزل ابھی دور معلوم ہوتی ہے، وہ منزل دور ہو لیکن وہ منزل آپ ہیں، اگر آپ محنت سے پڑھیں گے اور خاص طور پر عربی زبان اور عربی اور دینی علوم میں آپ یہاں رہ کر پختگی پیدا کریں گے تو یہ معجزہ ہے اس کی بڑی بڑی عمارتیں نہ بن سکیں، اور وہ کوئی بڑی شہرت حاصل نہ کرے، اور اس کا کوئی وسیع رقبہ نہ ہو، اور جامعہ کی شان نظر نہ آتی ہو تو کچھ حرج نہیں، آپ جامعہ ہیں، اگر آپ صرف و نحو میں اچھے ہیں، آپ کی استعداد پختہ ہو رہی ہے تو گویا جامعہ کامیاب ہے اور جامعہ کا کام شروع ہو گیا۔

اور اس کے بعد جب آپ کے اساتذہ مناسب سمجھیں تو آپ دیوبند، ندوہ جایئے، مظاہر العلوم جایئے، کسی مدرسے میں جایئے تو وہاں آپ ہی چمکیں گے، یہ آپ کو بتا دیتا ہوں میں کہ اگر آپ یہاں اچھی طرح پڑھ کر جائیں گے، دل لگا کر پڑھیں گے، صرف و نحو آپ کی اچھی ہوگی اور یہی کتابیں جو آپ کے نصاب میں ہیں، یہ پڑھ کر آپ وہاں جائیں گے، تو آپ ہی آپ ہوں گے، جو وہاں شروع سے پڑھ رہے ہوں گے، وہ آپ سے آنکھیں نہیں ملا سکیں گے، اس لیے کہ وہاں ساتھ ساتھ طالب علم کو ایک استاد لے کر بیٹھتا ہے، وہ تو پہچانتا بھی نہیں، چھ چھ مہینے گزر جاتے ہیں، اپنے شاگردوں کو پہچانتا نہیں، دیوبند میں تو اس سے زیادہ ہوتا ہے، وہ جلسہ ہوتا ہے درجہ نہیں ہوتا، میں بعض مرتبہ گزرا تو استاد صاحب تقریر کر رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا یہ ایک چھوٹا سا جلسہ تھا سیرت کا، اور اس میں کوئی صاحب وعظ کہہ رہے ہیں، اور باقی طالب علم کچھ ان کے پلے پڑ رہا ہے یا نہیں، اللہ بہتر جانتا ہے، تو آپ لوگوں کے لیے پہلی بات تو یہ ہے اور سب سے زیادہ آپ کے لیے کام کی اور ضروری کہ آپ محنت کیجیے اور کچھ کر لیجیے آپ بنیں گے، کہیں اور کوئی جگہ آپ کو بنانے والی نہیں، آپ کو بنانے والی جگہ یہی ہے، استادوں کو پکڑ لیجیے اور ان سے خارج وقت میں بھی، یعنی مدرسے سے علاحدہ جو اوقات ہیں، ان میں بھی آپ ان سے پڑھیے، ان کے گھر جایئے۔

علم حاصل کیا جانا چاہیے

اور یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ بھئی دودھ دوہا جاتا ہے، گائے دودھ دوہ کر نہیں دیتی، تو استاد درخت کی طرح ہے، درخت کا پھل توڑا جاتا ہے، یہ نہیں کہ آدمی اس کے نیچے منہ کھول کر لیٹ جائے اور امید میں رہے کہ پھل اس میں ٹپک جائے گا، اگر ناریل ہوا اور منہ پر گرا تو چوٹ بھی لگ جائے گی، خدا بچائے، لیکن کھجور جیسی کوئی چیز ہو تو چوٹ نہیں لگے گی، ایک افیونی لیٹا ہوا تھا کھجور کے درخت کے نیچے، اور منہ کھولے ہوئے تھا، کسی نے پوچھا: منہ کیوں کھولے ہوئے ہو بھئی؟ اس نے کہا کہ ممکن ہے ادھر کہیں کھجور گر جائے اور مجھے اٹھانا نہ پڑے، اور اٹھو کر گئے اس کو اٹھانا پڑے تو تکلیف ہوگی، تو میں پہلے سے منہ کھولے ہوئے ہوں، سیدھا منہ میں گرے، کوئی اس طرح مدرسوں میں نہیں ہوتا کہ آپ منہ کھول کر مدرسوں

پڑتی تھی اور بہت پھیلا کر کے کہنے پڑتا تھا، اس لئے کہ چھوٹی عمر کے بچے تھے، تو عموماً بچہ جب بچہ کہانی کہتا ہے تو کہتا ہے: "پھر یوں ہوا، پھر وہ ہوا" اور بہت سی باتیں زائد کہتا ہے، جن کا کہانی سے کچھ تعلق نہیں ہوتا، اماں نے یوں کہا اور بہن نے یوں کہا اور پھر نانی نے یوں کہا، اور یوں طول دیتا ہے، یہ بچوں کی فطرت ہے، اور ہم نے بھی اسی طرح سے کہانی شروع کی، تو اس سے مشق ہونی شروع ہوئی، اور ہماری مشق جو شروع ہوئی وہ کہیں مصر و شام جا کر نہیں ہوئی، کوئی یہ سمجھے کہ وہاں جب گئے تو مشق شروع ہوئی، ہماری مشق تو درجہ اول، درجہ دوم میں ہوئی، ہم نے پیغمبروں کے قصے کہنے شروع کیے، اور اس سے یہ "قصص النبیین" کتاب کا خیال پیدا ہوا اور وہ کتاب تیار ہوئی۔

طلبہ میں استعداد اور دینی ذوق پیدا کریں

اساتذہ سے یہ کہنا ہے کہ ایک تو استعداد پیدا کیجیے، آپ کا سب سے بڑا کام اور آپ کا بہت بڑا وظیفہ یہ ہے کہ آپ اپنے طلبہ کی صلاحیت کو درست کریں، آج سارے مدارس میں اور سارے ہندوستان میں استعداد کی کمی اور کمزوری ہے، جس میں شک نہیں، کہنے کی بات نہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ ابھی سے ان میں دینی ذوق پیدا کریں، دینی ذوق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ان کو تہجد پڑھائیں، اگر آپ پڑھائیں تو میں آپ کو روکوں گا کہ ابھی ان بچوں کو معاف کیجیے، مہربانی کیجیے، ابھی ان کے تہجد پڑھنے کا زمانہ نہیں آیا، ان کو سونا چاہیے، چھ گھنٹے ان کے لیے ضروری ہیں بلکہ سات آٹھ گھنٹے ان کے لیے سونا ضروری ہے۔

ذوق کا مطلب یہ ہے کہ دین ان کو اچھا لگنے لگے، دین کی عزت ان کے دل میں پیدا ہو جائے، اور دین کی محبت پیدا ہو جائے، اور اہل دین ان کو بھلے لگنے لگیں، دینی شعائر جو ہیں ان کو کوئی حقارت محسوس نہ ہو، بلکہ ان میں ان کی عزت اور عظمت محسوس ہو، یہ اتنی بات اگر آپ نے کر دی، انبیاء علیہم السلام کے قصے، پیغمبروں کے قصے ان کے کانوں میں پڑتے رہیں، اور اولیاء اللہ کے حالات ان کے کانوں میں پڑتے رہیں، تو پھر ان شاء اللہ یہ چاہے کتنی مغربی تعلیم حاصل کر لیں، اور چاہے یورپ اور امریکہ چلے جائیں، مگر وہ محبت جو ان کے دل میں بیٹھ گئی

ہے، وہ کبھی نکلے گی نہیں، یعنی دیکھیں کہ نماز کے لیے آپ کتنا اہتمام کرتے ہیں، آپ ان سے نہ کہیے کہ نماز کا وقت ہو گیا، آپ اظہار کیجیے یعنی ان کے سامنے نمونہ لائیے کہ جب اذان ہو جاتی ہے تو آپ کا کسی کام میں جی نہیں لگتا، اور نماز کا اہتمام، پھر آپ یہاں جتنی دیر رہے معلوم ہو، ان لوگوں کو محسوس ہو کہ آپ ہر جگہ خدا کو حاضر و ناظر سمجھتے ہیں، اور آپ نے باطن میں ہر وقت خدا کا خیال اور فکر رہتی ہے، اس طریقے سے گفتگو میں، ہر چیز میں آپ کا نمونہ ان کے سامنے ایسا آنا چاہیے کہ ان کے دل میں اثر عظمت قائم ہو گی، پختگی دین کی ہو۔ اگر الحاد کے دور سے بھی گزریں گے تو انشاء اللہ بچ جائیں گے۔

ابتدائی تربیت کا نتیجہ

ایک زمانہ میں میں نے ہندوستان کے چوٹی کے علماء، ادیبوں اور مفکروں کو جو اس زمانے میں جیسے ہو جیں میں تھے، ان کو خط لکھا کہ آپ سب لوگ یہ لکھیے کہ کس کتاب سے آپ کو زیادہ فائدہ پہنچا، چنانچہ بڑے اونچے اونچے لوگوں نے مضامین لکھے، ہر طبقے کے بہت ممتاز لوگوں نے مضامین لکھے، اور اس زمانہ میں "الندوہ" کا ایڈیٹر تھا، میں اور مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ہم لوگوں نے مضامین شائع کیے پھر اس کے بعد مولانا عمران خان صاحب نے اس کو ایک مجموعہ میں شائع کر دیا، "اہل علم کی محسن کتابیں"[1] کبھی خدا موقع لائے اور آپ لوگوں کو پڑھنے کا بھی شوق ہو، اور پڑھنے کی قابلیت ہو، پڑھیے گا اس کو بہت کام کی چیز ہے، تو اس میں میاں شبیر احمد صاحب، ابھی ان کا انتقال ہوا ہے پاکستان میں، پاکستان کے ترکی میں سفیر تھے، بڑے ادیب، "ہمایوں" کے ایڈیٹر تھے اور سرپرست، اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں بہت اونچا مقام تھا ان کا، ان کو بھی لکھا تو انہوں نے لکھا کہ مجھے پر بڑے بڑے شدید حملے ہوئے الحاد اور لادینیت کے، اور فلسفہ کے، اور بعض مرتبہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہ ایمان کی چنگاری بجھ جائے گی، اور ایمان کا شعلہ گل ہو جائے گا، اور شاید ہو بھی گیا، لیکن جب بجھ پر کوئی ترشح ہوتا تھا یا سخت صدمہ ہوتا تھا تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی

(۱) یہ کتاب اب دوبارہ "ادارہ احیائے علم و دعوت" لکھنؤ کی طرف سے مولانا فیض احمد جنگل ندوی کی تحقیق سے شائع ہو چکی ہے۔

شخصیت میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی، جس سے میں "الفاروق" کے ذریعہ سے متعارف
ہوا تھا، "الفاروق" پڑھیے علامہ شبلی کی، ان کو انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے، بس وہ میرے
دل میں تصویر بن گئی، اور جب مجھ پر الحاد کا اور روشن خیالی کا حملہ ہوا تھا تو میں کہتا کہ ایسا آدمی
بالکل نہیں ہو سکتا ہے جیسے حضرت عمرؓ کی شخصیت ہے، اور میں اس کی وجہ سے بچ گیا تھا۔

بچوں کے دلوں میں کسی شخصیت کی محبت پیدا کیجیے

ایسے ہی آپ لوگ ان بچوں کے دلوں میں کسی شخصیت کی محبت پیدا کر دیجیے، میں بہت
خوش ہوا کہ میں نے دیکھا کہ سیرت پر بچوں نے بڑے سلیقہ کی تقریریں کیں، اردو میں،
انگریزی میں، مجھے البتہ اس کی شکایت ہے اپنے عربی کے اساتذہ سے کہ عربی سے جتنا تناسب
ہونا چاہیے تھا وہ کم ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اپنا کوئی اس میں پورا حصہ نہیں رکھا کہ
یہاں جامعہ اسلامیہ میں، دو یا تین انگریزی کی تقریریں تھیں تو دو تین عربی کی ہونی چاہیے تھیں،
بلکہ زیادہ ہونی چاہیے تھیں، اب معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ انگریزی زیادہ آسان سمجھی جاتی ہے،
اور اس کے اساتذہ جلدی سے اس کی مشق کرا دیتے ہیں، یہ بات ہے یا یہ کہ جیسا کہ ہمارے
پرنسپل صاحب، بیلو ناظر صاحب نے جو جستہ جستہ کٹ کر رہے تھے، انہوں نے جیسا کہ کاٹ
چھانٹ کرنی پڑی، ممکن ہے عربی کی چند تقریریں باقی ہوں، سننے کا مجھے موقع نہ ملا ہو۔

عربی زبان کو مرکزی زبان بنائیے

میں یہاں میں اپنے ان عزیز بھائیوں سے یہ کہتا ہوں کہ عربی زبان کو مرکزی بنائیے اور
عربی زبان یہاں بہت نمایاں ہونی چاہیے، کوشش کیجیے۔ یہ اعتراض بالکل غلط ہے کہ عربی زبان
مشکل ہے، آپ کے لیے تو بہت آسان ہونی چاہیے، آپ لوگ مشق کرائیے، مکالمے
تقریریں، مضامین، سب چیزیں عربی میں ہوں، کتاب کو سمجھ لینا بالکل کافی نہیں۔

عربی زبان کی تعلیم کا اصول

فن تعلیم کے لحاظ سے کتاب کے معنی بیان کر دینا بالکل کافی نہیں، اس کو اتنا پڑھنا

چاہیے کہ اس کے بہت سے لفظ یاد ہو جائیں، اور اس کو مختلف طریقوں پر ادا کرنا چاہیے، بہت سے سوال کا جواب ہو، کبھی الٹ کر، کبھی پھیر کر، کبھی ادھر گھما کر، مثلاً: ابھی میں ممبئی کے ایک مدرسہ میں گیا، تو وہاں وہ پوچھ رہے تھے، سوالات اور جوابات جو پہلے سے تیار تھے، وہی کیے جا رہے تھے، اور لڑکے وہی رٹے ہوئے جوابات دے رہے تھے، میں نے کہا: یوں نہیں بلکہ سوال بدل کر پوچھیے، ان سے کچھ اور کی شکل میں پوچھیے، جس سے معلوم ہو کہ ان کے ذہن نے اخذ بھی کیا یا نہیں، مثلاً اگر یوں کہا ہو کہ "سچ بولنا کیسا ہے؟" تو کہیں گے: بہت اچھا ہے، یوں نہیں، بلکہ یوں بھی پوچھیے کہ "جھوٹ بولنا کیسا ہے؟" وہ کہیں گے "برا ہے" تب سمجھئے کہ انہوں نے اس بات کو سمجھا کہ سچ بولنا اچھا ہے، یا سب سے بڑی نیکی کی بات کیا ہے، یا جھوٹا آدمی کیسے ہوتا ہے، میں مثال دیتا ہوں، اس طرح بدل بدل کر جس سے معلوم ہو کہ وہ سمجھ بھی رہے ہیں یا نہیں، یا صرف رٹ لیا ہے۔

فارغ التحصیل کا لفظ بہت غلط ہے

اور باقی ایک بات اور بھی کہوں گا، اور سمجھتا ہوں کہ کچھ سب جانتے ہیں کہ کبھی بھی استادوں کو نہیں سمجھنا چاہیے کہ اب وہ فارغ ہیں، دیکھیے فارغ التحصیل کا لفظ بہت غلط ہے، ہمارے مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی نواب صدر یار جنگ بہادر بہت اعتراض کرتے تھے کہ فارغ التحصیل کیا مطلب؟ یعنی بس تحصیل سے فارغ ہو گئے، یا بالکل خالی ہو گئے، عربی میں فارغ کے معنی خالی کے ہیں، نہیں، اب تحصیل شروع ہوئی ہے، جو کسی مدرسے سے پڑھ کر نکلا، اس کو سمجھنا چاہیے کہ اب اس کا کام شروع ہوا ہے، اب ہی وقت وہ پڑھنے کے قابل ہوا ہے، یہ جو سمجھنے کے قابل ہوا، کچھ ذوق، وہ تو ایک چکر تھا نصاب کا، اور وہ ایسا چکر تھا کہ اس میں کچھ اور پڑھنے کی نوبت نہیں آتی تھی، اب جا کر کچھ ذوق پیدا ہوا، شدید پیدا ہوئی، اب پڑھنا چاہیے، آپ لوگوں کو مطالعہ جاری رکھنا چاہیے۔

چھٹیوں میں کسی کے ساتھ وقت گزاریے

اور میں یہ بھی کہوں گا، یہ بات تو ذرا کہنے کی تھی، معلوم نہیں کہ موقع ملے نہ ملے کہ

چھٹیوں میں بھی کسی کے ساتھ وقت گزار دے، کسی وسیع ماحول میں، جہاں کتب خانہ ہو، جہاں کتابیں ہوں، نئی نئی چیزیں آتی ہوں، بھینسہ و ممیت کے لیے کہیں کسی کے پاس چلے جایئے اور رہیے، تو اس سے انشاء اللہ جامعہ کو باہر سے کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہوگی، آپ ہی لوگ آخر تک کام دیں گے، یہ چند باتیں میں نے جلدی میں کہی ہیں، باقی بھئی! کرنے سے ہوگا، کہنے سے کچھ بھی نہیں ہوتا، اگر ہم روزانہ درس دیں جب بھی کچھ فائدہ نہیں۔

اسی مدرسے کو سب کچھ سمجھیں

ایک بات طالب علموں کو کہی کہ اسی مدرسہ کو سب کچھ سمجھ کر اور اس کو بہت بڑی درس گاہ سمجھ کر، اور جامعہ واقعی صحیح معنی میں بہت بڑا ہے، اس کو آپ کافی سمجھیں، اور کہیں کسی اور طرف خیال نہ کریں، اور یہیں محنت کریں اور اپنی استعداد بنائیں۔

اصل چیز ہے دین کی عظمت

اور اساتذہ سے میں نے کہا کہ نمونہ اور دین کی عزت و عظمت ان کے اندر بٹھا دیجیے، بس سب کام ہوگیا، یہ کنجی ہے، اگر نماز روزہ بھی ہے اور تہجد بھی ہے اور دین کی عظمت نہیں، کوئی فائدہ نہیں، کسی وقت بھی آدمی چھوڑ دے گا، اگر نماز روزہ نہیں، دین کی عظمت ہے، تو انشاء اللہ نماز روزہ بھی پیدا ہو جائے گا، اصل چیز ہے دین کی عظمت، یہ سمجھیں کہ دین کیا چیز ہے، دین والے کیسے ہوتے ہیں، تو انشاء اللہ پھر یہ محفوظ رہیں گے، ان کا ایمان محفوظ رہے گا، اتنا ہی کام آپ نے کر دیا تو آپ پورے طور پر کامیاب ہیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔ (۱)

---

(۱) جامعہ اسلامیہ (بھٹکل) میں ۳/جنوری ۱۹۸۳ء کو کی گئی ایک تقریر، ماخوذ از "ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام" صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۳۔

ایک آزاد ملک میں علماء کی ذمہ داری

اور ان کی مطلوبہ صفات

میرے قابلِ احترام بزرگو اور قابلِ محبت بھائیو اور عزیزو! میں اس وقت ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنے گھر میں ہوں، اور اس تعارف کے بعد جو مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی زیدت فیوضہم[1] نے میرے خاندان کا کرایا، اس کے بعد مجھے اور بھی قرب اور مؤانست محسوس ہوتی ہے۔ کم از کم وجہ یہ ہے کہ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عزیز طلبہ اور رفقائے کار اساتذہ کے سامنے بیٹھا ہوں اور ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ میں بہت شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے ان عزیزوں اور بھائیوں سے باتیں کرنے کا موقع دیا۔ اس کا امکان تھا کہ آپ میری صحت کی رعایت یا میری مشغولیت کے خیال سے مجھے دعوت دینا مناسب نہ سمجھتے، لیکن بہت اچھا ہوا کہ آپ نے یہ زریں موقع مہیا کیا۔

کچھ حقیقتیں اور کچھ تقاضے

تو اب میں بغیر کسی معذرت اور تمہید کے کچھ حقیقتیں اور کچھ تقاضے آپ کے سامنے رکھوں گا جو میں نے یہاں کراچی کے قیام کے چار دن کے مطالعہ اور مشاہدہ سے اخذ کیے ہیں۔

سیاسی اصطلاحات اور سیاسی تصورات اپنی جگہ پر ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ملتِ ہندیہ اسلامیہ کے علماء ان دو شاخوں میں ہیں جو ایک شاخ کے سپرد تقدیرِ الٰہی نے فیصلہ کیا کہ وہ چند متضاد

---

(1) دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل، محدث و فقیہ، مولانا محمود حسن خان ٹونکی کے پوتے، مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کے بعد مفتی اعظم پاکستان کہے جاتے تھے۔

مصروف رہے تاکہ وہاں دعوتِ اسلامی کا فرض انجام دے، اور مسلمانوں کے ملی تشخص کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں مشغول رہے، دوسرے حصے کے لیے قدرتِ الٰہی کا فیصلہ ہو کہ وہ اس ملک میں جہاں پہلے بھی مسلمان (اکثریت میں) تھے (بلکہ اسی راستہ سے برصغیر میں آئے تھے) ملت کی تعلیم و تربیت کا فرض انجام دے اور عالمِ اسلام کے لیے ایک آزاد اور مثالی اسلامی ملک کا نمونہ پیش کرنے میں مدد اور رہنمائی کرے۔

أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَأَنَا حَيٌّ؟

عزیزانِ گرامی! دنیا کے صالح و صحت مند تغیرات و انقلابات اور انسانی عزیمت کی فتوحات کی تاریخ پر اگر کوئی کتاب مستقل طور سے لکھی جائے تو تاریخ انبیاء اور افرادِ امت کی زبان سے جو جملے نکلے ہیں، ان میں ایک جملہ کو سب سے نمایاں اور ممتاز مقام دیا جائے گا اور اس کو آبِ زر سے لکھا جائے گا، یہ جملہ ایسا ہے جس نے حالات کی رفتار کو ایسا بدلا ہے جس کی مثال شاید دنیا کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے، جزیرۃ العرب کے ایک حصہ میں اور بعض قبائل میں ارتداد نے سر اٹھایا، یہ نازک ترین مرحلہ تھا، کہ آنحضرت (ﷺ) کے دنیا سے تشریف لے جانے کے قریب ہی زمانہ میں اسلام کے قلب و جگر میں ایک شگاف پیدا ہو رہا تھا، یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی، ابھی حضور اکرم (ﷺ) نے دنیا سے پردہ فرمایا ہے، اور کل کو کچھ ہی مہینے گزرے ہیں کہ عرب جن کو ساری دنیا میں اسلام پھیلانا تھا اور جن کو ایک امتِ مبعوثہ کی طرح اسلام کی دعوت دینی تھی، وہ خود ارتداد کے خطرے سے دوچار ہو رہے ہیں، ایسا نازک وقت پوری تاریخِ اسلام میں (وفاتِ نبوی کے بعد سے اس وقت تک) نہیں آیا، اس وقت حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کی زبان سے ایک فقرہ نکلا، جس نے تاریخ کا رخ اور واقعات کا دھارا بدل دیا، اور خطرے کا کہرا اس طرح چھٹ گیا جس طرح آفتاب کے نکلنے سے چھٹ جاتا ہے، آپ نے فرمایا (اور تاریخ نے اسی طرح ان الفاظ کو تبرک اور امانت سمجھ کر محفوظ کر لیا ہے) "أَيُنْقَصُ الدِّيْنُ وَأَنَا حَيٌّ؟" (کیا دین میں کوئی قطع و برید ہو سکتی ہے اور میں زندہ رہوں؟) کیا ابوبکر زندہ ہو اور پھر اللہ و رسول اللہ کے دین میں

جد و جہد اور اشاعت کتاب و سنت اور عقائد صحیحہ کی سرگرمی میں، یہی احساس کام کر رہا تھا، جس کی ترجمانی صدیق امت نے کی تھی، اور ہر دور کے نائبین رسول کو یہ روشنی دکھائی تھی:

﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ [سورۃ الزخرف: ۲۸]۔

علماء اپنا احتساب کریں

اس روشنی میں علماء اپنا احتساب کریں کہ انہوں نے اس جملہ کو کہاں تک اپنا اصول اور دستور العمل بنایا؟ وہ یہ دیکھیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ان کے ملک میں اسلام یا اسلامی معاشرہ کے زوال کا کوئی جواز ہے؟ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ میں ہمارے سامنے بڑی عبرتناک مثالیں ہیں، جن ملکوں میں اسلام کا زوال ہوا، یا وہاں دشمن اسلام طاقتیں غالب آ گئیں، آپ اگر تحقیق کریں گے تو ان میں کچھ ایسی چیزیں پائیں گے جن سے اس دور میں سبق لیا جاسکتا ہے، ان میں ایک چیز تھی علماء کا شدید اختلاف، اور دوسری چیز یہ تھی کہ علماء کا عوام سے رابطہ نہیں تھا، ان کی شخصیتیں اتنی موثر نہیں رہ گئی تھیں کہ عوام کے قلوب میں دین کا احترام اور علماء کا وقار قائم رکھتیں، وہ ملک جس نے خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ کو پیدا کیا، جس نے خواجہ عبیداللہ احرارؒ کو پیدا کیا، وہ ملک طاقتور روحانی شخصیتوں سے خالی ہو گیا تھا، معیار زندگی بہت بلند ہو گیا تھا، مادیت اپنے عروج پر تھی، ابھی تک امیر بخارا کا محل باقی ہے، اور کمیونسٹ حکومت اسے دکھاتی ہے کہ دیکھیے، کس طرح دولت جمع کی گئی تھی، کس طرح سونے چاندی کے ظروف تھے، بقول ان کے عوام بھوکے مر رہے تھے اور امیر بخارا کے محل میں یہ چیزیں تھیں، اسی طریقہ سے آپ اندلس کی تاریخ میں مدینۃ الزہراء اور قلعۃ الحمراء کی تفصیلات پڑھیں، خواب و خیال اور جن و پری کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، وہاں دو بڑے عنصر اسلام کے زوال کا باعث ہوتے ہیں، ایک معیار زندگی کی بلندی اور اللہ کی دی ہوئی دولت کا غلط استعمال، اور دوسرے یہ کہ اشاعت اسلام اور معاشرے کو اسلامی بنانے کے بجائے انہوں نے فنون لطیفہ، شعر و شاعری اور ادبیات وغیرہ پر ساری توجہ مرکوز کر دی تھی، تیسری بات یہ ہے کہ حکمراں خاندان میں حکومت کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی، سیاسی پارٹیوں کا وہ عہد نہیں ہے، اب اس کی جگہ سیاسی پارٹیوں نے لے لی ہے،

یہ تین عنصر تھے اندلس کے زوال کے، (اس پر اضافہ کیجیے اخلاقی زوال کا) آپ اگر "صبح سمرقند" کتاب پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہاں کیا اخلاقی زوال اور انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔

خطرات اور اندیشے

میں چند خطروں کی طرف نشاندہی کرتا ہوں، بعض مرتبہ باہر سے آنے والا اس چیز کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے جو گھر میں رہنے والا محسوس نہیں کرتا ہے، آپ روشنی میں ہیں، اگر کوئی شخص باہر اندھیرے سے آئے گا تو اس کی کیفیت دوسری ہوگی، اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ہر وقت دیکھتے رہنے اور سنتے رہنے سے ایسی مانوس ہو جاتی ہے کہ اس میں کوئی جدت نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں کوئی کشش نہیں ہوتی، لیکن باہر سے آنے والا اس کو فوراً محسوس کرلے گا، مثلاً یہاں اردو کے سائن بورڈ عام طور پر لگے ہوئے ہیں، آپ کو تو بالکل نہیں محسوس ہوں گے، لیکن ہم ہندوستانی جب یہاں آئیں گے، تو جو انگریزی یا ہندی کے سائن بورڈ دیکھنے کے عادی ہیں، تو ایک خوشی محسوس کریں گے، اور کہیں گے کہ ماشاء اللہ یہاں تو ہر طرف اردو ہی اردو نظر آتی ہے۔ ایسے ہی بعض لوگ تختیاں لکھ کر دیواروں پر آویزاں کرتے ہیں، تو ان میں جو چیزیں لکھی ہوتی ہیں آدمی غور سے پڑھتا ہے، پھر پڑھنا چھوڑ دیتا ہے، مجھے نہ کسی دور بینی کا دعویٰ ہے اور نہ دوربینی کا، نہ بصیرت و فراست کا، بقول اقبال۔

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام

ہاں میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں باہر سے آرہا ہوں، اس لیے میری بات توجہ کے قابل ہے۔

اعتقادی اور سیاسی انتشار سخت خطرناک ہے

اپنے اس تاریخی مطالعہ اور عالم اسلام سے قریبی واقفیت کی بنا پر کہتا ہوں کہ اعتقادی

اور سیاسی انتشار اس ملک کے لیے سخت خطرناک ہے، یہاں مذہبی گروہ ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں، بعض بحثیں جو علمی انداز میں ہوسکتی تھیں، ان کو عوام میں لے آیا گیا ہے، اور ان کی بنیاد پر متحارب کیمپ اور متوازی محاذ بن گئے ہیں۔ یہ سخت خطرناک بات ہے، میں بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جس سے آپ کا تعلق ہے، میرے احساسات بالکل وہی ہیں جو آپ کے ہیں، اور صرف احساسات نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں نے تو وہ جھنڈا بلند کیا جس کی وجہ سے ہم کو نئے نئے القاب ملے، اور سخت مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اگر زمین ہی پاؤں کے نیچے سے نکل گئی تو پھر یہ عمارتیں کس پر قائم ہوں گی؟ ایک گروہ یہ ثابت کرنے کی فکر میں ہے کہ پاکستان ہم نے بنایا ہے، دوسرا گروہ ثابت کرتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور ہمارا ہی اس ملک پر اقتدار اعلیٰ ہونا چاہیے، اگر ٹٹولا جائے (معاف کیجیے گا میں کسی پر حکم نہیں لگاتا) تو اس کے پیچھے حب جاہ کا جذبہ نکلے گا، ہمارے بزرگوں نے ملک میں دین کو بچانے کے لیے بڑی قربانی دی ہے، اور ضرورت پڑی ہے تو اپنی غلطی تسلیم کرلی ہے، اور دب گئے ہیں، جھک گئے ہیں، اور نیچے اتر آئے ہیں، انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ بھائی آپ ہی اوپر رہیے، مگر دین باقی رہ جائے، یہ ہمارے بزرگوں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے مسلک اور ان کے مکتب فکر کے لوگوں کی ہندوستان میں یہی روایت رہی ہے، آپ درس کے حلقوں اور علمی مجلسوں میں اختلافی مسائل پر آزادی کے ساتھ گفتگو کیجیے، ان مسائل پر کتابیں لکھیے، مگر ملک کو داؤ پر نہ لگائیے، جب کوئی ایسا محاذ قائم کیا جاتا ہے اور اس طرح کی دعوت دی جاتی ہے جس میں احساس برتری یا اظہار برتری ہوتا ہے تو اس کے مقابل دوسرا محاذ بن جاتا ہے اور وہاں سے صدا آتی ہے "ہم چنیں دیگرے نیست" بلند ہونے لگتی ہے، ہمارے بزرگوں کا سارا کام تو اخلاص کے ساتھ تھا، ہضم نفس کے ساتھ تھا، "ایمان واحتساب" کے ساتھ تھا، ان کو سیادت وقیادت کا دعویٰ تھا اور نہ یہ کہ ہماری جماعت ہی نے سب کچھ کیا ہے اور ہمیں سب کچھ ہیں، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکاتیب پڑھیے، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مکاتیب پڑھیے، ہندوستان کے اس دور میں جب مسلمانوں کے اقتدار کا چراغ ٹمٹمارہا تھا اور سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی، اس وقت انہوں نے احمد شاہ ابدالی، نجیب الدولہ وغیرہ کو جو

خطوط لکھے ہیں، ان کو آپ پڑھیے، ان میں کیا درد ہے، احمد شاہ ابدالی کو شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ایک مفصل خط لکھا ہے، اس میں بتایا ہے کہ مسلمان اس وقت کس بے بسی کی حالت میں ہیں، اس میں انہوں نے کیا موثر جملہ لکھا ہے جس سے ان کی دردمندی اور اخلاص ٹپکتا ہے: (میں رسول اللہ (ﷺ) کو شفیع بناتا ہوں کہ اللہ کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں پر رحم کیجیے اور ایک مرتبہ آجائیے)۔

چنانچہ احمد شاہ ابدالی انہیں کی دعوت پر آئے اور انہوں نے مرہٹہ طاقت کی ایسی کمر توڑی کہ آج تک وہ پورے طور پر سر نہیں اٹھا سکی، یہ شاہ ولی اللہ دہلوی ہی تھے اور ان کا درد تھا، اور ان کی بصیرت تھی جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا، آپ انہیں کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں، اس نسبت کا تقاضا ہے کہ ملت اور دین کے لیے جس ایثار و قربانی کی ضرورت ہے، وہ پیش کیجیے، اور صاف کہیے کہ اچھا بھائی! ہم ہی کیچ، تمہارا ہی کارنامہ سب سے بڑا ہے، ہم سب مل کر اس ملک کو بچائیں، موجودہ خطروں اور اندیشوں میں اس کی کیا گنجائش ہے کہ علماء اس طرح دست و گریباں ہوں، یہ بات میں اپنے عقائد کے پورے تحفظ کے ساتھ کہتا ہوں، الحمد للہ ایک شوشہ سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں، نہ عبادت کے مسائل میں، نہ اپنے عقائد کے اصول میں، کسی چیز میں کسی مفاہمت کے لیے میں تیار نہیں، ایک تو اپنا عمل ہے اور ایک یہ کہ اکھاڑہ بنا دیا جائے، عوام کو آلۂ کار بنایا جائے، اور سارے ملک کو میدان جنگ میں بدل دیا جائے، ایک کانفرنس ہو رہی ہے یا رسول اللہ کی اور ایک کانفرنس ہو رہی ہے محمد رسول اللہ کی[1] یہ جیتے کی باتیں نہیں، اس موقع پر اقبال کا شعر مجھے یاد آ رہا ہے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و ملا کی ناخوش اندیشی

عوام سے رابطہ بڑھائیے!

دوسری بات یہ ہے کہ عوام کے ساتھ آپ کا رابطہ ہونا چاہیے، میں نے محسوس کیا کہ علماء

(۱) اس وقت پاکستان میں یہی سننے میں آ رہا تھا۔

کا عوام سے جو ربط ہونا چاہیے اس میں کمی ہے، بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں علماء کا عوام سے ربط یہاں سے زیادہ ہے، وہاں سیاسی میدان میں بھی، علمی، ادبی اور تحقیقی میدان میں بھی علماء پیش پیش ہیں، اور ان کا مقام تسلیم کیا جاتا ہے، وہاں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ (Intellectual Class) علماء سے متوحش نہیں ہے، ہم ادبی اور علمی مجلسوں میں جاتے ہیں اور الحمد للہ وہاں ہم کو عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے، عوام سے آپ کا ربط بڑھنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ عوام آپ کے ہاتھ سے نکل جائیں۔

وقار اور امتیازی شان پیدا کیجیے!

تیسری بات جو عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ہماری زندگی عوام کی زندگی سے ممتاز ہو، دیکھنے والا دیکھے کہ یہ دنیا کے طالب نہیں ہیں، ان کے یہاں مال و دولت معیار نہیں ہے، ہمارے کام زیادہ تر حسبۃً للہ ہوں، جیسا کہ ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے، جب تک ہمارے طبقۂ علماء میں یہ اخلاقی امتیاز نہ ہوگا، ایثار کا مادہ نہ ہوگا، ان کی شخصیت مؤثر اور قابل احترام نہیں ہوگی، دل و دماغ میں دین کا گہرا اثر اور وقار نہیں ہوگا، علماء کا وقار اس سے نہیں بڑھے گا کہ یہ مدرسہ کتنا بڑا ہے، وہ مدرسہ اتنا بڑا ہے، وہاں اتنے طالب علم پڑھتے ہیں، اور وہاں کے جلسے اتنے کامیاب ہوتے ہیں، اس سے علماء کا وقار نہیں قائم ہوگا، علماء کا وقار قائم ہوتا ہے ذاتی نمونے سے، عوام جب دیکھتے ہیں کہ یہ چیز ایسی ہے کہ اس پر جان دے دی جائے، لیکن علماء اس کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے ہیں، وہ اس کو خاطر میں نہیں لاتے، ہم نے سمجھا ہے کہ دولت سب سے بڑی چیز ہے، ان کے یہاں دولت کی کوئی حقیقت نہیں ہے، جیسا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی نے نواب صاحب ڈھاکہ کو جواب دیا تھا، نواب صاحب نے کہلوایا کہ آپ ڈھاکہ تشریف لائیں، حضرت نے کہلوایا کہ نواب صاحب سے کہنا کہ آپ کے پاس جو چیز "دولت" ہے وہ میرے پاس بقدر ضرورت موجود ہے، لیکن میرے پاس جو چیز ہے وہ آپ کے پاس بقدر ضرورت بھی نہیں ہے، اس لیے آپ کو آنا چاہیے، مجھے آنے کی ضرورت نہیں۔

ایک واقعہ آپ کو اور سنا دوں، بڑا موثر ہے، شیخ سعید حلبیؒ ایک بزرگ عالم تھے، ایک دن دمشق کی ایک مسجد میں سبق پڑھا رہے تھے، اس دن ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی (یہ واقعہ اگرچہ میرا منہ اس قابل نہیں کہ سنائے، لیکن واقعات کے بغیر کام نہیں چلتا، چھوٹا آدمی بھی اگر یہ واقعہ سنائے تو اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے) ہاں! تو شیخ سعید درس دے رہے تھے، آپ جانتے ہیں کہ مسجد میں جب درس دیا جاتا ہے تو پشت قبلہ کی طرف ہوتی ہے اور سامنے طالب علم ہوتے ہیں، تو سامنے سے جو آتا ہے، استاد تو دیکھتا ہے طالب علم نہیں دیکھتے۔ ابراہیم پاشا جو محمد علی خدیو، بانی سلطنت خدیویہ کا فرزند تھا، اور بڑا باجبروت حاکم و سپہ سالار تھا، جس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور جس سے لوگ کانپتے تھے، وہ دروازہ کی طرف سے مسجد میں داخل ہوا، حضرت کے پاؤں میں تکلیف تھی، اس لیے دروازہ کی طرف پاؤں پھیلائے ہوئے تھے، جب وہ قریب آیا تو طالب علموں نے دیکھا کہ وہ ہے اور اس کے ساتھ حفاظتی دستہ بھی ہے، جلاد اور پہرہ دار بھی ہیں، طالب علم سمجھے کہ حضرت کو ذرا تکلیف ہو، پاؤں سمیٹ لیں گے، حاکم کا بھی ادب ہوتا ہے، شیخ نے بالکل جنبش نہیں کی، پاؤں پھیلائے رہے، وہ سامنے آیا اور کھڑا ہو گیا، مورخ نے لکھا ہے کہ طالب علموں نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے کہ اب جلاد کو حکم ہوگا اور استاد کا قابل احترام خون ہمارے کپڑوں پر نہ پڑے، وہ دیر تک کھڑا رہا، اس پر ایسا جلال طاری ہوا کہ کچھ بولا نہیں، سبق سنتا رہا اور پھر چلا گیا، بعد میں شیخ سعید حلبیؒ کے لیے اشرفیوں کا ایک توڑا بھیجا، اہل اللہ کا اثر ایسا ہی ہوتا ہے، سلام کہلوایا اور کہا کہ یہ قبول فرمایئے، جو جملہ انہوں نے جواب میں کہا، وہ جملہ سننے کے قابل ہے، میں تو کہتا ہوں کہ ایسے ایک جملہ پر غزلوں کے دس دیوان قربان کیے جا سکتے ہیں، انہوں نے کہا "اپنے ولی نعمت سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا" "اَلَّذِيْ يَمُدُّ رِجْلَهٗ لَا يَمُدُّ يَدَهٗ" یہ جملہ اسی طرح نقل ہوا ہے، اگر مجھے ہاتھ پھیلانے ہوتے تو میں اس وقت پاؤں نہ پھیلاتا، پاؤں سمیٹ لیتا، لیکن یہ علامت ہے کہ میں ہاتھ پھیلانے والا نہیں تھا، جو پاؤں پھیلاتا ہے ہاتھ نہیں پھیلاتا ہے، یہ جوہر علماء میں دین کے خادموں میں دسویں درجہ میں، پچاسویں درجہ میں سہی، ہونا چاہیے، اگر یہ جوہر نہیں ہے تو میں صاف کہتا ہوں کہ

آپ کی ساری علمی قابلیت اور آپ کی ساری خطابت جس میں آپ ممتاز ہیں (سیاسی جماعتوں میں بھی ایسے خطیب ہوں گے) سب بے اثر ہے، جب تک کہ آپ کا عملی نمونہ نہ ہو، اہل اقتدار یہ نہ سمجھیں کہ علماء خریدے نہیں جا سکتے، علماء پیسے کے غلام اور دولت کے بندے نہیں ہیں، علماء ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کر سکتے، علماء کی زندگی ہم سے زیادہ سادہ ہے، علماء ہم سے کم درجہ کے مکانوں میں رہتے، کم درجہ کا کھانا کھاتے ہیں۔ اس کا اظہار ہونا چاہیے، ہمارے اسلاف نے اس کا اظہار کیا ہے، میں اپنے اساتذہ ہی کے واقعات سناتا ہوں کہ میں مدرسہ قاسم العلوم میں پڑھتا تھا، اور وہاں ہم لوگوں کے لیے کبھی کبھی پر تکلف کھانے پکتے تھے، اور چونکہ میرا قریبی تعلق تھا، مدرسہ کے پیچھے حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کا قیام تھا، ان کے صاحبزادے مولانا حبیب اللہ صاحب مرحوم سے میرا قریبی تعلق تھا، وہ ہمارے دوست تھے، مجھے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ آج وہاں فاقہ ہے اور یہاں پلاؤ پکا ہے، کیا مجال کہ چاول کی ایک کھیل وہاں پہنچ جائے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے ہماری جماعت سے دین کی خدمت کا جو کام لیا ہے، وہ انہیں صفات کا نتیجہ ہے، زہد، ایثار، قربانی کا جذبہ، تواضع اور اپنے خلاف بات سن کر ضبط کر لینا، دوسرے کو اپنے سے بہتر اور فاضل سمجھنا، ہماری جماعت کا یہ شعار کبھی نہیں رہا ہے کہ "ہم چوں من دیگرے نیست" بلکہ ہم نے بڑے سے بڑوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے کو ہیچ سمجھتے تھے، مولانا مدنیؒ سے جب کوئی بیعت کے لیے کہتا تو میں نے حضرت کو بعض اوقات یہ شعر پڑھتے سنا ہے ۔

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم
در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا!

نہ پھول ہوں، نہ گھاس، نہ میں سبزہ ہوں، مجھے حیرت ہے کہ دہقان نے مجھے کس کام کے لیے پیدا کیا، ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اپنے سے شرمندہ ہیں، یہی بڑے سے بڑے اولیاء اللہ کا شعار رہا ہے۔

قابلیت کا سکہ جما دیں، لیکن حقیقی احترام عملی نمونہ، سیرت کی بلندی، زہد، استغنا، روحانیت
اور اخلاق عالیہ سے پیدا ہوتا ہے، علمی، فکری حیثیت سے بھی، اخلاقی اور روحانی حیثیت سے
بھی موثر شخصیتیں پیدا ہونی چاہئیں۔ ہمارے اکابر ایسے تھے، ہمارے اکابر ایسے تھے، ہر وقت
اس کی رٹ لگانا اور اس کا وظیفہ پڑھنا کچھ کام نہیں دیتا، میں نے پچھلی مرتبہ بھی جو تقریر کی
تھی اس میں کہا تھا کہ کوئی ملت اور کوئی دعوت تاریخ سے نہیں چلتی، تحریک سے چلتی ہے، ہم
پاکستان میں دعوت و مسلک تاریخ سے چلانا چاہتے ہیں، لوگ کہہ دیں گے کہ صاحب سن
چکے، بہت سن چکے، سنتے سنتے طبیعت بھر گئی، آپ کے اکابر ایسے تھے، ایسے تھے، "پدرم سلطان
بود، پدرم سلطان بود" بتایئے آپ کون ہیں؟ کام شروع کیجئے، تاریخ بہت سنائی جا چکی،
کتابیں بہت لکھی جا چکیں، پورا کتب خانہ تیار ہے، اب حرکت و عمل، جد و جہد و قربانی اور
پرکشش و سحر انگیز زندگی کی ضرورت ہے۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔ (۱)

---

(۱) جمعیۃ علماء اسلام، بنوری ٹاؤن (کراچی) میں مئی ۱۹۸۵ء میں کی گئی ایک تقریر، ماخوذ از "تحفۂ پاکستان" صفحہ ۶۵ تا ۷۷۔

حیثیت نظام حیات کے ایک مرتب و مدون قانون کی شکل میں موجود نہ ہوتا۔

تاریخ میں ان لوگوں کی خدمات کو سراہا جاتا ہے جو ملک فتح کرتے ہیں، ہمارے بڑے بڑے قائدین طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، عقبہ بن نافع، موسیٰ بن نصیر وغیرہ حضرات کی خدمات روز روشن کی طرح تابناک ہیں، لیکن جو لوگ مفتوحہ ممالک میں اللہ کے قانون کو رائج کرتے تھے، اور وہاں کی مشکلات و مسائل کو حل کرتے تھے، وہاں کی پیش آمدہ ضروریات کی تکمیل کرتے تھے، نئے نئے حالات جو پیدا ہوتے تھے، ان میں رہنمائی کرتے تھے، ان کی خدمات کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، حالانکہ اگر ائمہ مجتہدین، محدثین، علماء اس زمانے میں محنت کرتے، اور ان کا دماغ اس تلوار کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک کو فتح کرتی تھی، اور اس حکومت کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک میں نظم و نسق قائم کرتی تھی تو یہ سب کوششیں، فتوحات اور سلطنتیں بالکل کھوکھلی تھیں۔

مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ تاتاریوں نے عالم اسلام کو زیر و زبر کر ڈالا، عالم اسلام کی چولیں ہلا دیں، اس وقت مسلمانوں سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں تھا، آپ اس زمانے کی تصاویر دیکھیں جو آثار قدیمہ میں ملتی ہیں، تو ان سے اندازہ ہوگا کہ کسی مسلمان کی داڑھی کسی گھوڑے کی دم سے بندھی ہے، اور ایک تاتاری اسے کھینچے لیے جا رہا ہے، دنیا کی ہر قوم ان کی نگاہ میں عزت رکھتی ہے، لیکن مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل نہ تھا، اور خاص طور پر اس خطہ زمین کے مسلمان جو مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا تھا، یعنی ایران اور ماوراء النہر کا علاقہ، جو آخر میں فقہ کا (خاص طور سے فقہ حنفی) کا مرکز رہا ہے، لیکن آپ حضرات اس سے واقف ہیں کہ یہی تاتاری جو مسلمانوں کے فاتح تھے، اسلام کے مفتوح بن گئے، اور جن کو مسلمانوں کی تلوار شکست نہ دے سکی، ان کو مسلمانوں کی تہذیب نے، مسلمانوں کی ثقافت نے، مسلمانوں کے علم نے مسخر کر لیا، اور ان کو اپنا بے دام غلام بنا لیا، بات یہ تھی کہ تاتاریوں کے پاس کوئی علمی ذخیرہ، کوئی شائستہ تہذیب اور کوئی مرتب و وسیع قانون نہ تھا، ان کا ایک

سیدھا سادہ روایتی قانون تھا، جو قبائلی زندگی میں رائج تھا، اور کوہ قراقرم اور اس کے اطراف میں اس کا عمل دخل تھا، نیم وحشی اقوام میں جیسے "کلچر" ہوتے ہیں، وہ ویسے تھے، ان کے پاس کوئی آئین، کوئی تہذیب، کوئی لٹریچر نہیں تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مسلمان علماء اور دانشوروں کی ضرورت پڑی، مسلمان علماء اور دانشور جب ان کے دربار میں پہنچے تو ان کی عظمت کا، ان کی ذہانت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا، اسلامی تہذیب نے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری من حیث القوم مسلمان ہو گئے، مسلمان چونکہ صاحب دماغ تھے، ان کے پاس ذہانت کے سرچشمے تھے، ترقی یافتہ تہذیب تھی، ایک وسیع ثقافت اور علمی ذخیرہ تھا، وہ آئین سازی کا تجربہ رکھتے تھے، تمدنی مشکلات و مسائل کو حل کر سکتے تھے، تاتاریوں کو ان کی ضرورت پیش آئی، فلسفۂ تاریخ کا یہ ایک اہم اصول ہے کہ جنگی طاقت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی، جب تک اس کے پیچھے دماغ نہ ہو، آئین سازی کی طاقت نہ ہو اور کوئی منظم ادارہ نہ ہو۔

یہ دین جہالت سے نہیں بلکہ علم سے پیدا ہوا ہے

عصر جدید میں عالم اسلام کے علماء، جامعات کے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان، اور ہمارے قانون داں اور ہمارے ادیب و دانشور طبقہ کی ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ یہ دین جہالت کے بطن سے اور فوجی طاقت سے نہیں پیدا ہوا ہے، معرفت سے پیدا ہوا ہے، اللہ کی رہنمائی سے پیدا ہوا ہے، وحی سے پیدا ہوا ہے، یہ زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے، یہ تمدن کی رہنمائی کر سکتا ہے، اس کی نگرانی کر سکتا ہے کہ یہ تمدن بے راہ نہ ہونے پائے، فاسد نہ ہونے پائے، تخریبی راستہ اختیار نہ کرنے پائے، یہ تاثیر علمائے دین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی دے سکتا ہے، اور یہ بڑی ذمہ داری ہے، اگر کسی دین یا کسی قوم کے متعلق یہ خیال قائم ہو جائے کہ اس کا علم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے، بلکہ علم سے اس کو نقصان پہنچتا ہے اور جہالت سے اس کو فائدہ، تو خواہ تھوڑے عرصے کے لیے اپنے زور شمشیر یا اپنے بازو سے وہ جماعت یا جماعت یا قوم دنیا کے کسی حصہ پر قبضہ کر لے لیکن دماغوں پر اس کا قبضہ نہیں ہو سکتا، سب کی

خیال کریں گے کہ اس کو زندہ رہنے کے لیے جہالت کی تاریکی چاہیے، جب تک وہ تاریکی رہے گی، وہ زندہ رہے گا، اور جب علم آئے گا وہ غائب ہو جائے گا، اس کا پردہ چاک ہو جائے گا، اور جس طرح بدلی آفتاب کی روشنی سے پھٹ جاتی ہے، اسی طرح وہ پھٹ جائے گا، عیسائیت کا معاملہ یہی ہوا، عیسائیت نے علم کا ساتھ نہیں دیا، عیسائیت ایک خالص روحانی تحریک اور ایک معاشرتی انقلاب کے طور پر تو آئی، حضرت مسیح علیہ السلام کا جب تک زمانہ رہا، ان کی مقبولیت، ان کا تقدس، ان کی روحانی طاقت رہنمائی کرتی رہی، لیکن اس کے بعد پھر اس کو ایک زمانہ تک ذہین اور صاحب نظر لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہوا، پھر جب مسیحیت یورپ پہنچی تو سمجھا گیا کہ یہ زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لیے زندگی سے اس کو علاحدہ کر لینا چاہیے۔

عیسائیت مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی

یورپ اس وقت ترقی کر رہا تھا، یورپ کے اندر ترقی کی طاقتیں اور ولولے جوش مار رہے تھے، یورپ میں تنازع للبقاء کے لیے سخت کشمکش تھی، ان کی پلک ذرا جھپک جاتی تو یہ قوم کی قوم بالکل مغلوب ہو جاتی۔ عیسائیت جو ابھی بالکل اپنے دور طفولیت میں تھی، جس کی ابھی نہ تدوین تھی نہ شرح، نہ اس کے پاس آئین تھا، آئین میں وہ سارا انحصار یہودیت پر کرتی تھی، مسیحیت اپنے ساتھ کوئی مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی، شریعت موسوی تھی، جس میں جزوی تبدیلی کی گئی تھی ﴿وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ﴾ (سورۂ آل عمران: ۵۰) کہا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا ہے کہ میں تمہارے لیے مستقل شریعت لے کر آیا ہوں جو چیزیں یہودیت میں غلط طور پر داخل ہو گئی تھیں، مسیحیت ان کی اصلاح کرتی تھی، اس کے پاس مستقل کوئی آئین نہیں تھا، اور اس کا زیادہ تر زور رحم پر، محبت پر، انسان دوستی پر، مظلوموں کی شفقت پر، اجارہ داری اور اس کے غرور کو ختم کرنے پر تھا، جب یورپ جیسے بے چین ملک اور وہاں کی بے چین قوموں میں، جو زندگی کے لیے دوڑ رہی تھیں، مچل رہی تھیں، عیسائیت پہنچی تو یہ حقیقت بہت جلد منکشف ہو گئی کہ عیسائیت بدلتے ہوئے زمانہ، دوڑتے ہوئے

معاشرے اور اپنے ہوئے علم کا ساتھ نہیں دے سکتی، اسی وقت مسیحی علماء کی بہت بڑی ذمہ داری تھی کہ وہ مسیحیت کی افادیت کو ثابت کرتے اور رہنما اصول دیتے، زمانہ کے جائز تقاضوں اور فطرت انسانی کی جائز خواہشات کو قبول کرتے اور کہتے کہ یہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے ساتھ مذہب کی ہدایت اور نگہبانی چاہیے، یہ انہوں نے نہیں کیا، وہ دو گروہوں میں بٹ گئے، حاکمانہ گروہ نے مسیحیت کو بس عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا، اور باقی زندگی کو آئین کو، آئین سازی کو کھلی چھوٹ دے دی، دوسرا طبقہ علماء کا تھا، انہوں نے مخالفت شروع کر دی اور کہا ترقی ضروری نہیں ہے، بلکہ ترقی زندگی سے فرار میں ہے، کلیساؤں میں جانے میں، جنگلوں میں چھپ جانے میں، شادی نہ کرنے میں، ازدواجی زندگی سے منہ موڑ لینے میں، عورت کے سایہ سے بھاگنے میں ہے، اور اسی میں روحانیت کا بچاؤ ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقوں نے عیسائیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچایا، جو حاکم طبقہ تھا، اس نے آزادی کے ساتھ اپنے تمدن کا ڈھانچہ بنانا شروع کیا، لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا، جو مسیحیت کی تعلیم کے خلاف تھا، اس نے مسیحیت کو بدنام کیا، سینٹ پال کے زمانے سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور یہ تقریباً چوتھی صدی عیسوی سے آج تک جاری ہے، یورپ اسی راستے پر گامزن ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے کلیسا سے رشتہ توڑ لیا، کلیسا اور ریاست میں ہمیشہ کے لیے جدائی ہوگئی، اور عیسائیت سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ ہوگئی۔

اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے

یہ غلطی عالم اسلام میں الحمدللہ نہیں ہونے پائی، اس لیے کہ شروع سے اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ تھا، میں نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس کی پہلی وحی ﴿اقرأ﴾ کے لفظ سے شروع ہوئی ہو، اور جس کی پہلی وحی میں قلم کو فراموش نہ کیا گیا ہو، وہ علم اور قلم کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ اسلام میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دین و علم میں کبھی بھی دوری ہوگی، اس لیے کہ اسلام اور علم کا شروع سے ساتھ رہا ہے، جب بدر کے قریشی قیدی مدینہ پہنچے تو ان میں کئی ایسے تھے کہ وہ فدیہ ادا کر کے رہائی نہیں حاصل کر سکتے تھے، ان کا فدیہ یہ مقرر

کیا گیا کہ ہر شخص انصاریوں اور مہاجرین کے دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے۔

اسلام زمانہ کا رفیق ہی نہیں بلکہ راہ نما ہے

اس وقت عالم اسلام میں اہل علم کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ یہ تاثر نوجوان طبقہ میں نہ آنے پائے کہ اسلام محض طاقت اور حکومت کے بل پر قائم ہو سکتا ہے، وہ زمانے کی تبدیلیوں اور علم و فن کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، وہ اس زمانہ میں چلنے والی چیز نہیں، وہ ابتدائی سادہ اور محدود زمانہ کا ساتھ دے سکتا تھا، جب انسانیت عہد طفولیت میں تھی، لیکن اس پُرپیچ ترقی یافتہ اور وسیع تمدن کے دور میں اسلام زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا، سب سے بڑی خدمت علماء کی یہ تھی کہ وہ سادہ لفظوں میں اس چیلنج کو قبول کرتے، اور اپنی ذہانت سے، گہرے مطالعہ سے، اصول فقہ سے کام لینے کی صلاحیت سے، کتاب و سنت کے ان ابدی اور لازوالی اصولوں کی مدد سے جو ہر زمانے میں نسل انسانی کی رہنمائی کر سکتے ہیں، اس تمدن کو اسلام کے اصولوں کے مطابق رکھنے کی کوشش کرتے، اس میں اگر کسی ملک میں ذرا بھی کچھ کمی ہوئی، اس کا نتیجہ کم سے کم جو ہو سکتا ہے، وہ بے عملی اور شریعت کے خلاف زندگی ہے، اور بڑے سے بڑا نقصان جو ہو سکتا ہے وہ الحاد اور دین سے بغاوت ہے، کسی اسلامی ملک میں آپ دیکھیں گے کہ دوسرا نتیجہ ظاہر ہوا، اور کسی اسلامی ملک میں دیکھیں گے کہ پہلا نتیجہ ظاہر ہوا، حالانکہ دونوں نتیجے اسلام کے حق میں سم قاتل ہیں، سب سے بڑا کام اس وقت یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ اسلام اپنی روح اور مقاصد کے ساتھ اور اپنے انہیں اصولوں کے ساتھ زندگی کا نہ صرف ساتھ دے سکتا ہے، بلکہ رہنمائی کر سکتا ہے، ساتھ دینا تو میں نے علی سبیل التنزل کہا، وہ تو بہت ہی گھٹیا درجہ ہے، یہ اسلام کی کوئی تعریف نہیں ہے کہ وہ زندگی کا ساتھ دے سکتا ہے، نہیں، بلکہ وہ تو زندگی کی رہنمائی کر سکتا ہے، اس کو خطروں سے صرف وہی بچا سکتا ہے، اور وہ تمدن صحیح انسانی تمدن نہیں، اور وہ ریاست معتدل اور محفوظ ریاست نہیں جو اسلام کے اصولوں سے ہٹ جائے، یہ ثابت کرنا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ہے، دیکھیے جب کسی کا عزیز جاں بلب ہوتا ہے تو اس کے عزیزوں میں کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ تعریف کس کی ہو، سب کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمارا مریض بچ جائے، حکیم کے سر سہرا بندھے یا ڈاکٹر کے، تو اس وقت عالم اسلام بیمار ہے، آپ کا ملک بیمار ہے، آپ اس وقت بھول جائیے کہ کس کے حساب میں لکھا جائے گا، اور تاریخ میں لکھنے والے کیا لکھیں گے کہ اس ملک کو سب سے زیادہ نفع فلاں ادارہ، فلاں جماعت سے پہنچا، اور اس میں سب سے بڑا حصہ ان کا تھا، تاتاریوں کے بارے میں آج تک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ ان کو مسلمان کرنے میں سب سے بڑا حصہ کس کا تھا، اس لیے کہ ان مخلصین نے جنہوں نے یہ خدمت انجام دی تھی، اپنے کو اتنا چھپایا کہ تاریخ کی باریک بیں نگاہ بھی ان کو نہیں دیکھ سکی۔

اس وقت جو لڑائی لڑی جا رہی ہے، اس ملک کو اسلامی آئین دینے کی، اسلامی معاشرت و تمدن میں ڈھالنے کی، اور یہاں سے ان خرابیوں کو دور کرنے کی جو مغربی تمدن نے اور ہمارے سیاستدانوں نے داخل کر دی ہیں، اس لڑائی میں فوج کے ادنیٰ سپاہی بن جائیں، خالص اللہ کی رضا کے لیے کام کیجیے، اللہ کے یہاں آپ کا نام اس کے نورانی دفتر میں لکھا جائے گا، یہاں ہوا تو کیا اور نہ ہوا تو کیا، اس وقت لڑائی کسی مکتب خیال کی نہیں ہے، اس وقت لڑائی اسلام اور غیر اسلام کی ہے، اس طرح سمجھیے کہ ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے، اس میں جو بھی شریک ہو جائے سب اجر میں شریک ہوں گے، اس میں یہ سوال کہ کس کا کتنا حصہ ہے اور کس کا نام پہلے ہے، اور کس کا نام بعد میں ہے، یہ نہیں ہونا چاہیے، اس جذبہ کو جہاں تک ہو سکے مغلوب کرنا چاہیے، اپنے اپنے مسلک پر پورے طور پر قائم رہنا چاہیے، جسے ہم حق سمجھتے ہوں اس کو حق سمجھنا چاہیے، اس سے ہٹنے کی ضرورت نہیں ہے، سودا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن سب دعوت اسلامی کا محاذ اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کا محاذ بنائیں، اس ملک میں اسلامی زندگی پیدا ہو اور وہ آنکھوں سے دیکھی جا سکے اور یہ ملک دوسروں کے لیے نمونہ بنے۔

ایثار و قربانی

تیسری بات یہ کہ ہم جتنا بھی ہو سکے ایثار سے کام لیں اور باہمی نزاع سے پرہیز

کریں، ہماری زندگی جتنی سادہ ہوگی، ہماری زندگی میں جتنی قربانی ہوگی، اتنا ہی اثر پڑے گا، اتنا ہی بہتر نتیجہ نکلے گا، سب سے خطرناک بات آپس کی نزاع ہے، ہماری آپس کے دینی مباحث کا میدان اور ہے، اس کے کہنے کا موقع اور ہے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ اکبر اس لیے دین سے متنفر ہوا کہ اس نے علماء کو مرغوں کی طرح لڑتے دیکھا، اگر کوئی مسئلہ چھڑتا تو ان میں آپس میں اتنی تیز بحث ہوتی اور ہر ایک دوسرے پر اپنا تفوق اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ پکے دنیا والے اور جاہ طلب کرتے ہیں، اکبر نے سوچا کہ یہ کیسے لوگ ہیں، یہ ہمارے وزراء، ارکانِ سلطنت اور جاگیر دار دنیادار لوگ بھی اس سطح پر نہیں آتے، جب حضرت مجدد صاحبؒ کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر کا ارادہ ہے کہ وہ چند علماء کو اپنے دربار میں مشورہ کرنے کے لیے رکھے، تو انہوں نے نواب سید فرید کو خط لکھا کہ خبردار! خبردار! بادشاہ کو رائے دو کہ متکلم اور حقانی عالم صرف ایک آدمی کو رکھے، یہ مجدد صاحب کی فراست ایمانی تھی، جو انہوں نے اس بات کو سمجھا، میں نہیں کہتا کہ ہر موقع اور مجلس میں صرف ایک ہی عالم رہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ علماء کے آپس کے نزاعات اور بحث اور نفی کرنے سے اور ایک دوسرے کی تذلیل کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

خطرے کے اظہار کرنے کا بہر حال ہر شخص کو حق ہے، ایک بچہ بھی خطرہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ یہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے چور نہ آ جائے، اس طرح میں یہ دو تین چیزیں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک تو آپ جدید تعلیم یافتہ طبقے کو یہ تاثر نہ لینے دیں کہ کتاب و سنت اور اس کی تشریحات میں فقہ کا اور اصول فقہ کا جو ذخیرہ ہے، وہ موجودہ تمدن کا ساتھ نہیں دے سکتا، موجودہ مسائل حل نہیں کر سکتا، یہ خیال بڑا خطرناک ہے، یہ الحاد تک پہنچا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ عمل سے عوام پر اور خواص پر جو حکومت میں ہیں، یہ تاثر دیں کہ آپ کی سطح بلند ہے عوام کی سطح سے، آپ کی زندگی میں سادگی نظر آئے، وہ دیکھیں کہ آپ تھوڑی چیز پر قناعت کر رہے ہیں، یہ نہیں کہ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بڑی بڑی تنخواہیں ہوں اور گریڈ ہوں، اور جو تنخواہیں وزراء کو مل رہی ہیں، اور ان کو جو فوائد اور مواقع حاصل ہیں، وہ ہم کو بھی حاصل ہوں، ہماری کینڈلک کار ہو، ہمارے پاس بھی کوٹھی ہو اور وہ کسی وزیر کی کوٹھی سے کم

نہ ہو، بلکہ صاف صاف میں یہ کہوں گا کہ کوئی بوریہ نشین ہو تو زیادہ کام کر سکتا ہے، اس لیے کہ یہ طبقہ اسی کے سامنے جھکتا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی بے تکلف بوریہ نشین بنے، میں اس کی تعلیم نہیں دیتا، لیکن یہ واقعہ ہے، یہ طبقہ اسی کے سامنے آکر جھکتا ہے اور مانتا ہے جس کو سب سے زیادہ بے نیاز دیکھتا ہے، حضرت مجدد (رحمۃ اللہ علیہ) کے سامنے وقت کے شہنشاہ کیوں جھکے؟ اس لیے کہ یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی کسی کی سفارش کرتا ہے، اور نہ کبھی دربار میں آتا ہے، بیٹھا اللہ اللہ کرتا ہے، بیٹھے بیٹھے مشورہ دیتا ہے، ہمارے تمام مشائخ نے یہی کیا، کبھی بادشاہوں کے قریب نہیں گئے، مگر دور سے نگرانی کرتے رہے، حکومت کو اچھے آدمی دیتے رہے، دعا کرتے ان کے حق میں مشورہ دیتے رہے، لیکن وہ کہتے تھے کہ آگ کو دور سے تاپو تب تو ٹھیک ہے، اگر ہاتھ ڈال دو گے تو جل جاؤ گے۔

یہ چند باتیں ہیں جو میں نے مختلف موقعوں پر عرض کی ہیں، سب کا حاصل یہی ہے کہ اس وقت بڑا امتحان ہے ہمارا، پھر عالم اسلام کا امتحان ہے، ہمیں اپنی صلاحیت کا ثبوت دینا چاہیے، کہیں ہماری صلاحیت کی کمی سے اسلام کو نقصان نہ پہنچ جائے، کوئی یہ نہ کہے اور لکھے کہ علماء کی عدم صلاحیت سے یہ ہوا، میں اتنی باتیں بہت معذرت کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ [1]

---

(۱) جامع مسجد فیصل آباد (پاکستان) میں ۲۲ رجولائی ۱۹۷۸ء کو کی گئی ایک اہم تقریر، ماخوذ از "دعوت فکر و عمل" صفحہ ۹۶ تا ۱۰۳

غیرت صدیقی پیدا کیجیے!

﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ [سورۃ الزخرف: ۲۸]

حضرات! تاریخ میں اور بڑے بڑے پیشوایانِ مذاہب اور داعیانِ انقلاب اور مصلحینِ امت اور بانیانِ سلطنت کے تذکرے میں ان کے بہت سے جملے نقل کیے گئے ہیں، جن میں ان کے دل کی تڑپ اور ان کا اندرونی سوز، ان کا یقین جھلکتا ہے، یقیناً ہے، اور ان فقروں نے اپنے اپنے وقت پر بڑا کام کیا ہے، لیکن میرا جتنا مطالعہ ہے اور جس نے کم سے کم تین زبانوں عربی، فارسی اور اردو میں جو تذکرے پڑھے ہیں، اور جو تاریخ کی کتابیں پڑھی ہیں، ان میں ایک جملہ مجھے ایسا ملا ہے جس میں ایک کتاب ہی کا مضمون نہیں بلکہ اس میں ایک طوفان ہے، اور اس ایک جملہ نے وہ کام کیا ہے جو بڑی بڑی فوجوں نے، بڑی بڑی طاقتوں نے، بڑی بڑی سلطنتوں نے، اور بڑی بڑی قوموں نے، اور بڑے بڑے عزم و ارادہ نے وہ کام نہیں کیا۔

وہ فقرہ ہے جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں، اور میں چاہتا ہوں کہ وہ آپ لے کر جائیں، مجھے بعض مرتبہ کسی بین الاقوامی اجتماع میں جس میں عالم اسلام کے (کم سے کم) ممتاز ترین افراد جمع تھے، اور بڑے بڑے علماء اور مفکرین، اور بڑے بڑے اپنے ملک کے قائدین جمع تھے، مجھ سے آخر میں کہا گیا کہ میں کچھ عرض کروں، تو میں نے ان کی خدمت میں بھی وہی جملہ پیش کیا، میں نے کہا کہ آپ اتنے دن سے تقریریں سن رہے ہیں اور تقریریں کر رہے ہیں، اور اجلاس میں شریک ہیں، یہاں سے آپ کیا امانت لے کر جائیں گے؟ کیا پیغام لے کر جائیں گے؟ اور کس چیز کو اپنا رہبر بنائیں گے؟

وہ فقرہ حضرت صدیق اکبرؓ کا فقرہ ہے، جس کا ترجمہ ممکن نہیں، اور اگر بہتر سے بہتر

زبان میں ترجمہ کیا جائے تو وہ جوش، وہ درد اور وہ یقین کہاں سے آ سکتا ہے جو اس جملہ کے اندر ہے؟ اور جس جملہ نے کہا جا سکتا ہے کہ کایا پلٹ دی، بالکل انقلاب برپا کر دیا، اور آج ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اور آپ جس دین کے امین ہیں، جس دین کے حامل ہیں، اور جس دین پر عمل کر رہے ہیں، اور آج جو دین اسلامی اور شریعت اسلامی اس وقت روئے زمین پر ہے، اور جس کے نتیجہ میں یہ ہزاروں، لاکھوں مدارس قائم ہوئے ہیں، اور علوم شرعیہ کی تعلیم ہو رہی ہے، اور دین کے نام پر ہر زمانہ میں لوگ اپنی جانیں دیتے رہے، مال دیتے رہے، اور اپنی عزیز سے عزیز ترین متاع لٹاتے رہے، یہ سب اس جملہ کے سر ہے جس کے متکلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

ایسا بھی ہوا ہے کہ بولنے والا، متکلم تو متکلم ہے، لیکن اس کے کلام نے وہ اثر کیا ہے جو بڑے بڑے زندہ انسان اور بڑے بڑے طاقتور سلاطین، اور بڑی فوجوں اور فوجی طاقتوں نے ہلاک نہیں کر سکے، یہ وہ جملہ ہے کہ جس وقت عرب کی سرزمین پر ارتداد پھیلنے لگا، اور ارتداد پھیلا اور طوفان کی طرح پھیلا، سیلاب کی طرح پھیلا، یہاں تک کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ اب اس دین کا اللہ ہی محافظ ہے، اب آثار اچھے نہیں معلوم ہوتے، اور مدینہ طیبہ، جواثی اور طائف ایسے مقامات تھے کہ جہاں مسلمان سمٹ کر رہ گئے تھے، اور وہاں دین اپنی پوری شکل میں موجود تھا۔

اس وقت صدیق اکبر نے جو صحیح معنوں میں خلیفۃ الرسول تھے، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد حکمت الٰہی نے جس شخصیت کا انتخاب کیا، اس میں راز یہی تھا کہ سب سے پہلے اس دین کے محفوظ ہونے کی ضرورت تھی، امامت کا درجہ بعد میں ہے، سلطنت کا درجہ اس کے بھی بعد میں ہے، اور معاشرے کا درجہ اس کے بھی بعد میں ہے، لیکن پہلے مسئلہ یہ تھا کہ دین محفوظ رہ جائے، اپنے صحیح عقائد کے ساتھ اور اپنی صحیح دعوت کے ساتھ، اور اللہ تعالیٰ کا کلام محفوظ رہ جائے، اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو، تو یہ مزاج حضرت ابوبکر صدیق کا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے۔ یہ محض اتفاقی واقعہ نہیں، ﴿ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ﴾ [سورۃ الأنعام: ۹۶] - حضور (ﷺ) کے بعد امت کو یہ الہام فرمایا، امت کو یہ توفیق دی اور اس کے دل میں یہ ڈالا، جس میں حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ)

سب سے آگے تھے کہ ان کو جانشین پیغمبر، خلیفۃ الرسول بنانا چاہیے۔

تو جب یہ ارتداد کی آگ پھیل رہی تھی، اور تین طرح کے لوگ تھے جیسے کہ امام خطابی نے 'معالم السنن' میں تجزیہ کیا ہے، کچھ تو وہ لوگ تھے جنھوں نے مطلق ارتداد اختیار کر لیا تھا، یعنی وہ کہتے تھے کہ ہم اس دین پر نہیں رہیں گے، ہم نے اس دین کا انکار کیا، کچھ وہ لوگ تھے جو زکوٰۃ کے منکر تھے، یعنی حکم زکوٰۃ کے، مسئلۂ زکوٰۃ کے، ان کا کہنا یہ تھا کہ زکوٰۃ کوئی چیز نہیں، ہم نہیں مانتے۔ کچھ وہ لوگ تھے جو زکوٰۃ کو مانتے تھے، لیکن یہ کہتے تھے کہ ہم بیت المال کو دینے کے پابند نہیں، ہم ہمیں وصول کریں گے، اور اپنی صوابدید کے مطابق ہمیں صرف کریں گے۔

لیکن پہلا گروہ جو تھا، وہ تو کھلا ہوا مرتد تھا، اور وہ دوسری نبوتوں کے پرچم کے نیچے، مسیلمہ کذاب کے جھنڈے کے نیچے، یا سجاح کے جھنڈے کے نیچے، یا طلیحہ کے جھنڈے کے نیچے آ گیا تھا، اور دوسرا گروہ جو زکوٰۃ کی فرضیت کا منکر تھا، اس نے بھی کفر اختیار کیا، لیکن تیسرا جو تھا وہ صرف یہ کہتا تھا کہ ہم زکوٰۃ کے قائل ہیں، زکوٰۃ ادا کریں گے، لیکن ہم اس کے پابند نہیں کہ ہم بیت المال کو دیں، تو حضرت ابوبکر صدیق اس وقت کھڑے ہوئے، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو بکری کے گلے میں باندھنے والا رسی کا پھندا دیتا تھا، جو اس کا بھی انکار کرے گا میں اس سے بھی لڑوں گا، اور 'عناقاً' کا لفظ کہا کہ جو ایک بکری کے بچہ کو بھی نہیں دے گا، میں اس سے بھی لڑوں گا۔

کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی کتر بیونت ہو سکتی ہے؟

اس وقت ان کی زبان سے ایک جملہ نکلا، وہ جملہ ایسا ہے کہ وہ ایک کتاب نہیں بلکہ ایک کتب خانہ پر بھی بھاری ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بعد اسلام کا بچنا اور فرائض کا اپنی اصلی حالت پر رہنا، اور امت مسلمہ کا اس دین کو مضبوطی سے پکڑنا، ان سب میں اس جملہ کا اثر ہے، اس جملہ کا فیض اس میں شامل ہے، وہ کیا جملہ تھا؟ عربی کے تین چار لفظ ہیں، ایک جملہ ہے: "أينقص الدين وأنا حي؟" "کیا دین میں کوئی کتر بیونت ہو سکتی ہے اور ابوبکر زندہ ہے؟ کیا ابوبکر کی زندگی میں دین کی زنجیر، دین کی طلائی زنجیر کی کسی کڑی، اس کے

عثمانیوں کی سلطنت کی شکل میں، اور مغلوں کی سلطنت کی شکل میں، اور آج یہ مصر و شام اور عراق، اور پھر یہاں تک کہ میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جزیرۃ العرب میں جب بھی کوئی حکومت قائم ہوئی، جزیرۃ العرب کی نسبت کے باوجود بھی، یہ اس کا فیض نہیں ہے، اس کا کارنامہ نہیں ہے کہ آج اسلام باقی ہے، یہ آج جو اسلام باقی ہے، اپنی اصلی شکل میں، وہ غیرت صدیقی کا نتیجہ ہے، اسی غیرت صدیقی کا حامل علماء کو ہونا چاہیے، اور اسی غیرت صدیقی کے حاملین نے اسلام کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھا ہے۔

میں آپ کے سامنے، علمائے کرام کے سامنے صرف تین واقعات کا انتخاب کرتا ہوں۔

امام احمد بن حنبلؒ اور فتنہ خلق قرآن

ایک جب خلق قرآن کا فتنہ آیا اور مامون جیسے باجبروت بادشاہ نے یہ دعوی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت روئے زمین کی سب سے بڑی شہنشاہی (جسے امپائر کہتے ہیں) وہ سلطنت عباسیہ تھی، سلطنت عباسیہ کے مطلق العنان فرمانروا مامون نے عقیدۂ خلق قرآن کی سرپرستی کی، میں اس کی اس وقت تشریح نہیں کر سکتا، آپ بہت دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں، اور یہ ایک علمی بحث ہے، اس کو آپ تاریخ میں یا علم کلام کی کتابوں میں دیکھیے کہ اس خلق قرآن کے عقیدہ کے کیا اثرات ہو سکتے تھے؟ ان میں سے ایک ادنی اثر بتاتا ہوں جو سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک تھا، کہ یہ سمجھا جائے کہ حضور اقدس (ﷺ) کے قلب مبارک پر معانی نازل ہوئے لیکن آپ نے ان معانی کو ان مضامین کو اپنے الفاظ میں ادا کیا، تو خلق قرآن سے یہ نتیجہ بھی نکل سکتا تھا، تو یہ بہت فلسفیانہ اور دقیق کلامی بحث تھی، مامون نے اس کی سرپرستی کی، اور صرف سرپرستی ہی نہیں کی بلکہ وہ اس کا وکیل بن گیا، اس کو اپنی عزت اور سلطنت کی طاقت کا نشان بنا دیا، علامت بنا دیا کہ اگر وہ لوگ اس کو نہیں مانتے تو گویا سلطنت سے باغی ہیں، اور میرے نافرمان ہیں۔

اس وقت اللہ کا ایک بندہ جس کا نام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) جو ائمہ اربعہ میں سے ایک امام ہیں، اور اپنے زمانہ کے وہ امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں، امام بخاری وغیرہ

سب ان کے شاگرد ہیں، وہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اس کا انکار کیا، انھوں نے کہا: نہیں قرآن مجید اپنے الفاظ کے ساتھ، اپنے معانی کے ساتھ، اپنے لفظوں کے ساتھ، ایک ایک حرف کے ساتھ کلام الٰہی ہے، اسی طرح نازل ہوا لوح محفوظ سے، اسی طرح قلب اطہر پر نازل ہوا اور آپ نے اپنی زبان مبارک سے ادا کیا، اور ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾ [سورة النجم: ۳-۴]

مامون کے بعد معتصم آیا، اس نے جلادوں کو بلایا اور ان جلادوں کو تیار کیا، اور امام احمد بن حنبل سے کہا: اے ابوعبداللہ! اگر تم اس کے قائل ہوتے ہو تو میں ولی عہد کو ہٹا کر، ولی سلطنت کو ہٹا کر تم کو اپنے پہلو میں جگہ دوں گا، یہاں آ کر بیٹھو، اور اگر تم اس کے قائل نہیں ہوتے ہو تو یہ جلاد کھڑے ہیں، انھوں نے کہا: "أَعْطُونِي شَيْئًا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ أَوْ سُنَّةِ رَسُولِهِ حَتَّى أَقُولَ بِهِ" میں کچھ نہیں جانتا، آپ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے سند لائیں، میں ابھی قائل ہوتا ہوں، اس نے جلاد کو حکم دیا، جلاد نے ایک کوڑا مارا، جلاد خود کہتا ہے کہ خدا کی قسم! اگر ہاتھی پر وہ کوڑا پڑتا تو چنگھاڑ مار کر کے بھاگتا، لیکن کوڑا کھانے کے بعد انھوں نے پھر کہا: "أَعْطُونِي شَيْئًا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ أَوْ سُنَّةِ رَسُولِهِ حَتَّى أَقُولَ بِهِ"، دوسرے تازہ دم جلاد کو حکم ہوا، اس نے کوڑا مارا، اس طرح اتنے کوڑے ان کے لگائے گئے کہ وہ اٹھنے کے قابل نہیں تھے، بڑی مشکل سے سہارا دے کر ان کو سواری پر سوار کیا گیا، اور جیل بھیج دیا گیا، داستان لمبی ہے، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے بعد واثق آیا، وہ اس میں ذرا نرم پڑا، اس کے بعد متوکل آیا، اس نے فرمان واپس لیا، اس وقت علماء میں یہ محضر پھرایا گیا تھا، اور چند علماء تھے امام احمد بن حنبل کے ہم مسلک اور ہم مزاج ان کے طریقہ پر، جنھوں نے محضر پر دستخط نہیں کیے، بہت سے علماء نے دستخط کر دیے، لیکن فتنۂ خلق قرآن فرو ہوا اور ایسا فرو ہوا کہ صرف تاریخ کی کتابوں کے اندر، اوراق کے اندر دفن ہو کر رہ گیا، اگر ہم ہی لوگ نہ بتائیں، اگر میں ہی آپ سے ذکر نہ کرتا، میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس پورے مجمع میں شاید یہی علمائے کرام جو یہاں اسٹیج پر رونق افروز ہیں، یہ فتنۂ خلق قرآن سے واقف ہیں، اس اصطلاح سے، اس کے معانی سمجھتے ہیں، پورے مجمع میں شاید دس آدمی بھی نہیں ملیں جو خلق قرآن کیا ہوتا ہے، اور فتنۂ خلق قرآن کیا تھا، اور کب ہوا تھا، یہ فن کو

داستان پارینہ بنا نے والا، اس کو کتابوں میں دفن کر دینے والا، اس کی دعوت کو دنیا میں قیامت تک کے لیے۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ مٹا دینے والا۔ یعنی اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اور کتنے ہی فتنے آئیں، خلق قرآن کا فتنہ اب دنیا میں زندہ نہیں ہوگا، یہ کارنامہ امام احمد بن حنبل کا تھا، جس کے لیے اس زمانہ کے لوگوں نے کہا کہ اُنْصُرُوكُمْ يَوْمَ الرِّدَّةِ وَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ يَوْمَ الْمِحْنَةِ، یہ دو بہت بڑے دین کے محافظ تھے اور انھوں نے آخری درجہ کی قربانی دی، اور آخری درجہ کی خدمت کی، حضرت ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے فتنہ ارتداد کے مقابلہ میں اور امام احمد بن حنبل نے فتنہ خلق قرآن کے مقابلہ میں، تو وہ ایک غیرت الرسول کی، ایک صدیق اکبر کی غیرت تھی، وہ ان کی شان اور ان کی سطح کے مطابق تھی، اور یہ ایک عالم دین کی غیرت تھی اور ایک محدث کی غیرت تھی، لیکن دونوں میں غیرت تھی، اس غیرت نے یہ پورا جو ایک جال پھیلا ہوا تھا، وہ ہم آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ کیا تزلزل تھا بغداد کی مجلسوں میں، بغداد کی محفلوں میں، گھروں میں، درس کے حلقوں میں، جہاں پڑھے لکھے آدمی جمع ہوں وہاں، کوئی محفل شاید خالی ہوتی ہو اس پر تبصرہ کرنے سے، اور سب لرزہ براندام تھے، جو اہل غیرت تھے، جو دین کی حفاظت کرنا چاہتے تھے، وہ لرزہ براندام تھے کہ کیا ہوتا ہے؟ اور جو اس کے داعی تھے، وہ بھی متفکر تھے، ایک عالم کی غیرت نے، ایک عالم کی استقامت نے اس فتنہ کا خاتمہ کر دیا۔

تاتاریوں کا قبول اسلام

پھر میں تیسری چیز کا ذکر کرتا ہوں، تاتاریوں کا جب حملہ ہوا، تاتاریوں کے حملہ کا آپ اس وقت اندازہ نہیں کر سکتے، میں صرف ایک بات کہتا ہوں کہ جو تاتاری چین سے نکلے، اور وہ چینی ترکستان میں اور مشرقی ایشیا میں پھیل گئے، یہ ترکستان جو آج روس کے ماتحت ہے، پہلے اس میں پھیل گئے، اور سمرقند و بخارا ان کا نشانہ بنا، لیکن ان کے فتنہ کی ہولناکی کا یہ حال تھا کہ یورپین مؤرخوں نے لکھا ہے کہ انگلستان کے ساحل پر مچھلی کا شکار کرنے والے مچھیرے جن کا ذریعہ معاش یہی تھا، ماہی گیری تھی، وہ کئی ہفتے تک تاتاریوں کے ڈر سے نہیں نکلے، کہ کہیں تاتاری یہاں نہ آجائیں۔ جو دنیا کے نقشہ پر نظر رکھتے ہیں، جغرافیہ سے

واقف ہیں، کہاں یہ چین، کہاں یہ ترکستان اور ایشیا کا یہ مشرقی کنارہ، اور کہاں انگلستان کا وہ ساحل لیکن ایسی ہولناکی تھی، ایسی دہشت پھیلی ہوئی تھی کہ وہ ہمت نہیں کرتے تھے، اور پھر اس زمانہ کی ایک مثل تھی، یہ آج تک عربی کی کتابوں میں محفوظ چلی آ رہی ہے: "اِذَا قِیْلَ لَکَ اِنَّ التَّتَرَ انْھَزَمُوْا فَلَا تُصَدِّقْ" ہر بات مان لینا، ہر ممکن الوقوع واقعہ پیش آ سکتا ہے، لیکن کوئی تم سے کہے، کیسا ہی سچا آدمی کہے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی، اس پر یقین نہ کرنا۔ تاتاری شکست کھانے والے ہیں ہی نہیں، تاتاری اور شکست! ناممکن ہے، دونوں باتیں جمع نہیں ہو سکتیں، وہ تاتاری کہ جن کا حال یہ تھا کہ ایک عورت چلی جاتی تھی سینکڑوں کے مجمع میں، اور مارنا شروع کرتی تھی، لوگ گردنیں جھکا دیتے تھے، پھر ان میں سے کوئی پکار کر کہتا کہ ارے! یہ عورت ہے، یہ تو خاتون ہے، تب لوگ کچھ سنبھلتے۔

اور یہ سب تاریخ میں لکھا ہوا ہے کہ بعض اوقات ایک تاتاری ایک مسلمان کے پاس سے گزرا، مسلمان اس زمانے کے سپہ گری سے واقف ہوتے تھے، ہمارے آپ کی طرح نہیں تھے، وہ اسلحہ بھی رکھتے تھے، وہ اپنا دفاع بھی کر سکتے تھے، ایک تاتاری ایک مسلمان کے پاس سے گزرا، اس سے کہا: دیکھو بھائی! میرے پاس اس وقت تلوار نہیں، اتفاق سے کوئی چھری چاقو نہیں، تم اس پتھر پر سر رکھ کر لیٹ جاؤ، میں چھری چاقو لے کر آتا ہوں، تمہیں ذبح کر دوں گا۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ وہ اسی طرح سے دم بخود پڑا رہتا تھا، حرکت نہیں کرتا تھا اپنے قتل کے انتظار میں، یعنی بھاگ سکتا تھا، کہیں منہ چھپا سکتا تھا، درخت پر چڑھ سکتا تھا، ہمت نہیں تھی، یہ حالت تھی تاتاریوں کی کہ وہ ناقابلِ شکست سمجھے جاتے تھے، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسلام کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔

آرنلڈ نے اپنی تاریخ "Preaching of Islam" میں صاف کہا ہے کہ کوئی دور سے دور کی پیشین گوئی بھی، ناقابلِ قیاس سے ناقابلِ قیاس بات بھی اس سے بڑھ کر نہیں تھی کہ تاتاری مسلمان ہو جائیں گے، سب کچھ ہو سکتے تھے، مسلمان نہیں ہو سکتے تھے، مسلمان ان کے نزدیک اتنے ذلیل تھے کہ اس وقت کی جو تصویریں ملی ہیں جو ماسکو اور لینن گراڈ کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں، ان میں دکھایا گیا ہے کہ گھوڑے کی دم سے ایک مسلمان کی ڈاڑھی بندھی

ہوئی ہے، ایک مسلمان عالم کی ذہنی بلندی دکھائی گئی ہے اور وہ اپنے گھوڑے کو بھگاتا ہوا چلا جا رہا ہے، اور وہ مسلمان اس کے ساتھ جا رہا ہے، اس کا کام تمام ہو گیا، یہ تصویریں ملی ہیں۔

آرنلڈ نے لکھا ہے کہ یہ چیز کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی، لیکن اس کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی تھی کہ تاتاری اسلام قبول کر لیں گے۔ یہاں تک کہ اس نے لکھا ہے کہ اگر کچھ توقع کیا جا سکتا تھا تو اتنا کہ تاتاری عیسائی ہو جائیں گے، اس لیے کہ ان کے محلوں میں بکثرت ان کی مسیحی بیگمات تھیں، جو مسیحی بھی ہوتی تھیں، جن کو وہ گرجستان سے یا کہیں سے وہ لائے تھے، تو اگر وہ دین قبول کرتے تو عام طور سے اپنی بیویوں کے اثر سے، حرم سراؤں کے اثر سے، لوگ دین بھی بدل دیتے ہیں، اور اپنا تمدن بھی بدل دیتے ہیں، سب کچھ بدل دیتے ہیں، اس نے کہا کہ لیکن اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ اسلام قبول کریں گے، میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جا سکتا، لیکن تاریخ نے یہ شہادت دی، جیسا کہ آرنلڈ نے لکھا ہے کہ اسلام اپنے عسکر سے بلند ہوا، اسلام جو عسکر کے پیچھے تھا، آگے بڑھ کر وہ جو پیچھے رہ گیا تھا، پیچھے ہو گیا تھا، اس نے سر نکالا، سر اٹھایا، اور جن تاتاریوں کو مسلمان نہیں بنا سکے تھے فاتح تاتاری اسلام کے مفتوح بن گئے، اور مفتوح مسلمانوں نے تاتاری فاتحوں کو اسلام میں کلمہ پڑھایا، اور اپنا حلقہ بگوش بنایا۔

یہ کس کا کام تھا؟ یہ صوفیائے کرام کا کام تھا، یہ ان باعزیمت مسلمان وزراء کا کام تھا، اور داعیان اسلام کا کام تھا جو خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے تھے، اور تاتاریوں کو تبلیغ اسلام کرتے تھے، میں صرف ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں کہ ہمارے لیے بڑی عبرت کا واقعہ ہے، کہ ایران میں تاتاریوں کی جو شاخ تھی، تغلق تیمور جس کا ولی عہد سلطنت تھا، اور تاتاریوں کی ایک شاخ بغداد میں تھی، اور ایک بہت بڑی شاخ ایران میں تھی، جو ایران و ترکستان تک پھیلی ہوئی تھی، تو تغلق تیمور شکار کرنے کے لیے نکلا، اور شکاریوں میں کچھ توہمات ہوتے ہیں، آپ حضرات جانتے ہیں، جو شکار کھیلتے ہیں، ان میں سے ایک توہم یہ تھا کہ ہماری شکارگاہ میں ایرانی نہ آنے پائے نہیں تو شکار نہیں ملے گا، ہم جب شکار کھیلنے نکلتے تو ہمارے زمانہ میں یہ تھا کہ چھری کا کوئی نام نہ لے، یا چاقو کا کوئی نام نہ لے، ورنہ شکار نہیں ملے گا، جمعرات کو شکار نہیں ملے گا، اور کئی ایسی چیزیں تھیں، یہ سب وہمی باتیں تھیں، لیکن تھیں، تو ان تاتاریوں میں یہ تھا کہ ایرانی سب

سے زیادہ وہ ذلیل ہوتے ہیں، اور منحوس ہوتے ہیں، اگر ایرانی کہیں سے آ گیا تو شکار نہیں ملے گا، اللہ کو کچھ اور کرنا مقصود تھا، کچھ اور دکھانا تھا۔ شیخ جمال الدین ایرانی کہیں جا رہے تھے، شہزادے کی شکارگاہ راستہ میں پڑ رہی تھی، ان کو خبر نہیں تھی، وہاں اتفاق سے کوئی پہرہ نہیں تھا، پہرہ دار بھی کہیں کھانے پینے کے لیے ہٹ جاتے ہیں، غفلت برتتے ہیں، آج بھی ہوتا ہے پہلے بھی ہوتا تھا، تو وہاں کوئی پہرہ دار نہیں تھا، وہ اندر آ گئے، وہ بڑھتے چلے آئے، یہاں تک کہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں پہرہ دار تھے، کہا کون؟ ایرانی؟ کہا: ہاں، اس کو پکڑا اور شہزادے کے پاس لے گیا، کہ دیکھیے ایک بدنصیب ایرانی یہاں آ گیا، اور شہزادے کو سخت طیش آیا کہ ساری محنت برباد ہوئی، سب پر پانی پھر گیا، یہ منحوس کہاں سے یہاں آ پڑا، اور اب شکار نہیں ملے گا، اس زمانے میں امراء کے پاس، بادشاہ کے پاس کتا ہوا ہی کرتا تھا، یہ واقعات آرنلڈ نے بھی Preaching of Islam میں لکھا ہے، اور اس سے بہتر انداز میں ترکی اور فارسی کتابوں میں ہے، جن سے میں نے اخذ کیا ہے، وہ میں آپ کو سناتا ہوں، جو ہماری فارسی کی قدیم کتابوں میں ہے کہ کتا اس کے پاس تھا، اسے غصہ میں کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ یہ کتا اچھا ہے؟ انھوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا (اور بالکل الہامی جواب تھا، اللہ نے الہام فرمایا) کہ ابھی اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، کہا: کیوں ابھی فیصلہ نہیں ہو سکتا؟ یہ کتا ہے، تم ایرانی ہو، تو یا یہ کہو کہ میں افضل ہوں، میں بہتر ہوں، تلوار تیار ہے گردن اڑانے کے لیے، یا یہ کہو کہ شہزادے کا کتا مجھ سے بہتر، بھلا میں شہزادے کے کتے کے مرتبہ کو کیا پا سکتا ہوں؟ انھوں نے کہا: میں ابھی نہیں کہہ سکتا، پوچھا: کب کہو گے؟ کہا: اگر ایمان پر خاتمہ ہوا تو میں افضل ہوں، اگر ایمان پر میرا خاتمہ نہ ہوا تو یہ کتا افضل ہے۔ بس اس کے دل پر ایک چوٹ لگی، پوچھا: ایمان کسے کہتے ہیں؟ کہا کہ ایمان یہ ہے کہ اپنے خالق کو پہچانے، اس دنیا کو پیدا کرنے والے کو جانے اور اس کو یہ سمجھے کہ وہ اکیلا ہے، اس دنیا کا کارخانہ چلا رہا ہے، اس کے پیغمبروں کو پہچانے، اور آخری رسول محمد رسول اللہ (ﷺ) کو پہچانے، اور آخرت کو مانے اور یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جانا ہے، اور حساب دینا ہے، اس نے سنا، ہونے والی بات یہ کہ بس اس کے دل پر ایک اثر پیدا ہوا، اس نے کہا: اچھا، اس وقت تو آپ چلے جائیے، اور پھر اشارہ کیا کہ ان کو چھوڑ دیا جائے، لیکن اگر آپ یہ سنیں کہ تغلق

اور ایک کتب خانہ کی موجودگی اور فراہمی میں ان اللہ کے بندوں کو آج کے فضلائے مدارس سے کوئی نسبت نہیں تھی، انھوں نے تاتاری جیسی قوم کو جنھوں نے عالم اسلام کو پامال کر کے، تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا، اور شہر کے شہر، خوارزم اور سمرقند جیسے شہر کھنڈر بنا کر رکھ دیے تھے اور انسانوں کے سروں کے مینارے بنا دیے تھے، ان کو جن لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور ان کو مسلمان بنایا، ان کی تعداد، ان کے وسائل، ان کے اثرات، اور ان کی مدد کرنے والی چیزیں بہت کم تھیں، اور آج کے زمانے میں آزادی کی جو سہولت حاصل ہے، آج ہر ایک کو اپنی بات کہنے کی جو آزادی ہے، اور آج دوسرے کو مشورہ دینے کی جو آزادی ہے، وہ اس وقت بالکل نہیں تھی، خاص طور پر جب کہ مسلمان اس وجہ مغلوب اور بے بس ہو گئے تھے، یہ تیسری مثال ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی کی غیرت ایمانی

چوتھی مثال حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ہے، ان کے دل پر ایک چوٹ لگی جب اکبر کو ایران کے ملحدوں نے یہ پٹی پڑھائی، کہ ہر مذہب کی عمر ایک ایک ہزار برس ہوئی ہے، مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے، دین اسلام کی عمر بھی ایک ہی ہزار برس ہوگی، یہی خدا کے یہاں کا قانون ہے، وہ ایک ہزار برس گزر گئے، اب ضرورت ہے کہ نبی امی کی جگہ شہنشاہ امی لے، اور وہ اب قیادت کرے، اب وہ امت اسلامیہ کی قیادت کرے، اب نئے عہد کی قیادت کرے، وہ ایک نیا فکر دے، نیا مذہب دے، نیا قانون دے، اکبر خود ان پڑھ تھا، اور مناظرے وغیرہ اس کے دربار میں ہوتے تھے، اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا، کتابوں میں تفصیلات موجود ہیں، اکبر نے اس بات کو مان لیا اور اس کا داعی اور علم بردار بن گیا کہ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا، یعنی ہر طرح سہولت تھی، خنزیر کا گوشت عام تھا، لیکن گم یقر کا کوئی استعمال نہیں کر سکتا تھا، اور اس کی سزا اکثر اوقات موت ہوتی تھی، اسی طریقے سے یہاں تک نوبت ہے کہ اس کے دربار میں کوئی حضور (ﷺ) کا نام نہیں رکھ سکتا تھا، اس کے چہرے پر پیشانی پر شکن آ جاتی تھی، اگر کوئی بچے بیٹے کا نام محمد بتائے یا احمد

الف ثانی کا فیض تھا، اور دراصل کس کا فیض تھا؟ غیرت دینی کا فیض تھا، اور عزیمت مردانہ کا فیض تھا، اور اس قوت ایمانی کا فیض تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے امت کا رشتہ دین سے منقطع ہو؟ ملت کا رشتہ دین سے منقطع ہو؟ وہ اپنی شریعت سے، شریعت پر عمل کرنے سے مجبور کر دی جائے؟ وہ اپنے شرعی عائلی قانون پر عمل نہ کر سکے؟ وہ میراث کو شرعی طریقہ پر تقسیم نہ کر سکے؟ وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم نہ دے سکے؟ وہ ان کو اپنے دین کے شعائر کا پابند نہ بنا سکے؟ نماز روزہ کا پابند نہ بنا سکے؟ اور ان کے عقائد کو اسلام کے مطابق نہ بنا سکے؟ وہ دینی طور پر بھی ارتداد کا راستہ اختیار کر لیں، اور معاشرتی طور پر، تہذیبی طور پر بھی اور ثقافتی طور پر بھی؟

غیرت صدیقی پیدا کیجیے!

ساری باتیں آج بھی آپ نے سنیں، بڑی اچھی سے اچھی موثر تقریریں سنیں، آپ نے مضمون سنے، اور کل بھی آپ سنیں گے، اور ان شاء اللہ پرسوں بھی سنیں گے جو رہیں گے، لیکن میں ایک نکتہ کی بات ہزار باتوں کی ایک بات آپ سے کہتا ہوں جس کو آپ لے کر جائیے کہ "أینقص الدین و أنا حي؟" آج یہ ملت اسلامیہ بحیثیت ملت کے، اور ہمارے بحیثیت ایک مجموعہ مدارس کے، ایک مکتب خیال کے، اور ایک پوری نسل کے اور جماعت کے، اور پھر الگ الگ ہر مدرسہ اور الگ الگ مدرسہ کا فاضل جو مدرسہ سے پڑھ کر نکلا ہے، اس کے لیے جو چیز حیات میں تغیر پیدا کر سکتی ہے، میں آپ کو ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے، ایک جہاں گرد اور جہاں دیدہ انسان کی حیثیت سے، کہ کم ملک اس کے مواقع سے اور اس کی ذاتی واقفیت سے خارج ہوں گے، مختلف مذہبوں کے، مختلف مکاتب خیال کے اور دانشوروں کی کتابیں پڑھنے والے انسان کی حیثیت سے میں آپ سے کہتا ہوں، صرف میں ایمان بالغیب کے طور پر نہیں، ایمان بالغیب تو اصل ہے، لیکن میں بالکل فکری طور پر، عملی طور پر، اور ذہنی طور پر مطمئن ہوں کہ اگر کوئی چیز یہاں صورت حال میں تبدیلی پیدا کر سکتی ہے، تو وہ ہے "أینقص الدین و أنا حي؟" کا جذبہ، کہ ہمارے ہوتے ہوئے اتنے فضلاء جس ملک میں موجود ہوں، اتنے مدارس اس ملک میں موجود ہوں، وہاں ارتداد ہوتے؟ وہاں یہ معلوم نہ ہو کہ اسلام اور مسلمان کس طرح زندگی گزارتا ہے؟ وہاں جو مسلمانوں کے تہذیب کی

جو خصوصیات تھیں، پردہ تھا، حیا اور عفت تھی، اور بڑوں کا ادب تھا، اور انسان کا احترام تھا، اور
خدا پرستی تھی، زر پرستی کے بجائے خدا پرستی تھی، وہ ملت ایسی ہو جائے کہ نہ اس کے ممیز عقائد، نہ
امتیازی عقائد، نہ اس کی امتیازی تہذیب، نہ اس کی امتیازی معاشرت، نہ اس کی امتیازی
ثقافت، حال یہ ہو جائے کہ نواسے اور پوتے، اپنے نانا اور دادا کو نہیں بلکہ بیٹے اپنے والدین کو
ہندی اور انگریزی میں خط لکھنے پر مجبور ہوں، اس لیے کہ ان کو اردو نہیں پڑھائی گئی، اتنی بڑی
ملت، اتنی تعداد میں فضلاء، اتنی تعداد میں مدارس کے ہوتے ہوئے اس ملک سے اردو مٹ
جائے؟ یہ ایک چیستاں ہوگی، ایک پہیلی ہوگی آئندہ کے مؤرخین کے لیے، جس کو وہ بوجھ
نہیں سکیں گے، اور اس کی کوئی تشریح نہیں کر سکیں گے کہ کس نے یہ اردو زبان مٹائی؟ یہ حکومت
مٹا سکتی ہے جب تک کہ خود ان کے ساتھ انسانوں کا فیصلہ، انسانوں کی رضا مندی، اور
انسانوں کا اس کو تسلیم کر لینا یا اس کے سامنے سپر ڈال دینا شامل ہو؟

تو میں ساری ذمہ داری اس وقت ملت اسلامیہ پر ڈالتا ہوں، اور خصوصیت کے ساتھ
فضلائے مدارس پر ڈالتا ہوں، اور ان لوگوں پر کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی دولت دی ہے،
کہ اگر اس ملک میں دین کا کوئی شعبہ — خدانخواستہ — زوال کی نذر ہوا، انقلاب کا نذر رہا، تو
اس کی ذمہ داری میں باوجود اس کے کہ مجھے کوئی ڈر نہیں ہے، اور جو مجھے جانتے ہیں وہ جانتے
ہیں کہ میں نے ہمیشہ بڑے بڑے لوگوں سے، سلاطین سے بھی، الحمد للہ جن سلاطین سے
مجھے ملنا ہوا، ان سے بھی میں نے بالکل برابری کی گفتگو کی، لیکن میں اسے انصاف کا تقاضا
سمجھتا ہوں کہ میں اس کی ذمہ داری حکومت پر نہیں، اس ملت اسلامیہ پر ڈالتا ہوں، ان
فضلائے مدارس پر ڈالتا ہوں جن کے اندر "أَيَنْقُصُ الدِّينُ وَأَنَا حَيٌّ؟" کی غیرت نہیں ہے،
اور یہ جذبہ نہیں ہے کہ ہمارے ہوتے ہوتے کیسے یہاں دینی ارتداد، تہذیبی ارتداد، معاشرتی
ارتداد اور ہمہ گیر ثقافتی ارتداد آ سکتا ہے؟ کہ سارا ہمارے بزرگوں کا جو اندوختہ، ذخیرہ اور
کارنامہ ہے، آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی کے بعد سب سے بڑا دین کا ذخیرہ اور سب سے اعلیٰ
درجہ کی کتابیں اور دین کی تشریحات اور بعض تو وہ کہ جن کی عربی میں مثال ڈھونڈھنے سے
شاید ملے گی، بے شک عربی عربی ہے، وہ قرآن و حدیث کی زبان ہے، اور رسول اللہ
(ﷺ) کی زبان ہے، صحابہ کرامؓ کی زبان ہے، لیکن ایسا ہے کہ یہاں ہندوستان کے

عالموں نے عربی میں ایسی کتابیں لکھی ہیں کہ جن کی مثال عرب ملکوں میں نہیں ملتی۔ یہ تو میں دعوی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ حجۃ اللہ البالغۃ کی مثال، ہر نہیں ہے۔ ایسی اور کتنی کتابیں ہیں کہ نام لینا اس وقت مشکل ہے، اور بہت سے لوگ ان کو جانتے بھی نہیں، لیکن اس کے بعد اردو میں جو ذخیرہ ہے، حدیث کی تشریحات کا جو ذخیرہ ہے، سیرت نبوی پر کتابوں کا، علم کلام پر کتابوں کا، اور دینیات کی کتابوں کا، اور تاریخ کا، یہ کسی زبان میں نہیں، یہاں تک کہ فارسی میں بھی نہیں ہے، یہ سب ذمہ داری آپ کی ہے۔

اور بات صرف اتنی ہے کہ ہمارے اور آپ کے اندر کسی درجہ میں، کسی نسبت کے ساتھ، کم سے کم درجہ میں بھی حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی اس غیرت کا کچھ حصہ آ جائے جس نے دین کو بچا لیا، اور آج ہم سب اسی دین کے سایہ میں ہیں، اسی دین کو پکڑے ہوئے ہیں جو ابوبکر صدیق کی اس عزیمت کا اور اس غیرت ایمانی کا نتیجہ تھا۔

ہمارے اندر کسی درجہ میں یہ بات پیدا ہو، ہر مسئلہ حل ہے، ہر مشکل آسان ہے، ہر ناممکن بات ممکن ہے، کوئی چیز بھی یہاں، بڑی سے بڑی طاقت یہاں کچھ بھی نہیں کر سکتی، اگر آپ کے اندر آج بھی غیرت پیدا ہو جائے، ہم اپنے بچوں کو کیوں نہ دین پڑھائیں؟ ہم اپنے بچوں کو کیوں نہ اردو سکھائیں؟ اپنے بچوں کو پہلے دین کے عقائد بتائیں گے، ان کو مسلمان بنائیں گے، پیغمبروں کے حالات سے آشنا کریں گے، رسول اللہ (ﷺ) کی سیرت سے ان کو واقف کرائیں گے، اور ان کو کلمہ سکھائیں گے، اور ان کو نماز سکھائیں گے، اور اگر اس کے بعد ان کے عقیدہ میں فرق آتا ہو، آنے دو یار آئے، لیکن ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے کہ ہمارے گھر کے بچے جیسا کہ حضرت مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب نے کہا کہ باپ تہجد گزار اور ذاکر شاغل، بیٹا یا پوتا فرشتوں کا منکر، وہ آسمانوں کا منکر، وہ معراج کا منکر، یہ ہو رہا ہے، انھوں نے ایک گھر کی مثال دی، سیکڑوں گھر اس وقت مسلمانوں میں ایسے ہوں گے کہ جہاں ایک نسل تہجد گزار اور ولی صفت ہے، اور دوسری نسل کا ایمان خطرہ میں ہے۔

نسل نو کے ایمان کی فکر کیجیے!

اور میں نے جیسے کہ بڑے بڑے تبلیغی اجتماع میں کہا، اور پھر کہتا ہوں اور اس لیے کہتا

ہوں کہ بات پکی ہے اور ہر جگہ کہی جاسکتی ہے، کہ اگر آپ کی موجودہ نسل پوری کی پوری ولی بن جائے، میں نہیں کہتا کہ تہجد گزار بن جائے، میں نہیں کہتا کہ دو دو چار چار حج کر آئے، بلکہ ولی بن جائے، صحیح معنی میں، تب بھی کافی نہیں ہے جب تک کہ آپ اپنے بچوں کو کسی درجہ میں مسلمان نہ بنائیں، اور اس کا اطمینان نہ کرلیں کہ آپ کے بعد وہی کہیں گے جو حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے کہا تھا، اور لکھنؤ کے اسی دینی تعلیمی کونشن کا اختتام میری ہی تقریر پر ہوا، اور شاید اس وقت کا اجلاس بھی میری ہی تقریر پر ختم ہوا، وہاں میں نے دیہات سے آئے ہوئے مجمع میں جو ہزاروں کی تعداد میں تھا، میں نے کہا کہ یہ کیا لے کر جائیں گے؟ یہ تجاویز جو قانونی زبان میں لکھی گئیں، اور پڑھی گئی ہیں، اور یہ قانونی نکتہ آفرینیاں اور یہ اس کے مباحث کہاں ان کی سمجھ میں آئیں گے؟ یہ کیا کہیں گے اپنے گھر جاکر کہ ہم کیا سن کر آئے؟ میں نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیت پڑھی، اور یہ حسن اتفاق ہے کہ مولانا مفتی عبد العزیز صاحب نے اس آیت سے پہلے کی آیت پڑھی تھی، اور میں اس کے بعد کی آیت پڑھتا ہوں أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ [سورۃ البقرۃ: ١٣٣] کہ یعقوب نے اپنے بیٹوں، پوتوں، نواسوں اور اس وقت کی جو نسلیں ہولی تھیں، برکت ہوئی تھی نسل میں، اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پرپوتے بھی ہوں گے، اور پرنواسے بھی ہوں گے، سب کو جمع کیا، اور یہ کون ہیں؟ جنھوں نے جب آنکھ کھولی، بلکہ آنکھیں کھولی بھی نہیں تھیں کہ اللہ کا پاک نام ان کے کانوں میں پڑا تھا، جنھوں نے اللہ کے نام، اللہ کی توحید، اللہ کی وحدانیت کے سوا اپنے گھر میں کچھ سنا نہیں تھا، جنھوں نے بلوغ سے پہلے سے نمازیں پڑھنی شروع کردی ہوں گی، اور یہ پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے، جنھوں نے سوائے پیغمبروں کے قصوں کے، سیدنا ابراہیم کے، بنائے کعبہ کے، اور ذبیح اسماعیل کے قصے کے، اور آتش نمرود میں کود جانے کے قصے کے، اور اس کے گل و گلزار بن جانے کے قصے کے، اور شرک کا انکار کرنے اور ﴿كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا

گھروں کی فضا دینی بنائیں!

بس اس پورے کنونشن کا پیغام آپ جو لے کر جائیں، وہ یہ ہے کہ اپنے گھروں کی، اپنے خاندانوں کی، اپنے محلوں کی، اپنے قصبات اور گاؤں کی، اور سب سے بڑھ کر اپنی اولاد کی ذمہ داری آپ پر ہے، آپ ان کی فکر کریں، آپ ان کی دینی تعلیم کا انتظام کریں، ان کو مکتب میں بھیجیں، چاہے اسکول میں بھیجیں، لیکن ایک شبینہ یا صباحی مکتب ہو، اس میں بھیجیں، اور ان کا اتنا وقت نکالیں کہ وہ وہاں جاکر قرآن مجید پڑھنے کی صلاحیت پیدا کریں، اتنی اردو پڑھ لیں کہ قرآن شریف پڑھ سکیں، اور باقاعدہ قرآن شریف بھی پڑھیں، اس کے بعد دین کی بنیادی باتیں ان کو بتائی جائیں، اور گھر میں بھی تذکرہ ہو تو توحید کا تذکرہ ہو، انبیائے کرام کا تذکرہ ہو، بجائے سیاسی باتوں کے، اخبارات آپ پڑھتے ہیں، دن بھر اس پر رائے زنی کرتے ہیں، یہ دیکھتا ہے کہ قرآن مجید سے پہلے جو چیز ہمارے ہاتھ میں آتی ہے، وہ اس دن کا اخبار ہوتا ہے، جو زیادہ پڑھے لکھے ہیں ان کے ہاتھ میں انگریزی اخبار ہوتا ہے، اور جو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں ان کے ہاتھ میں اردو اخبار ہوتا ہے، گھر میں تذکرے ہوتے ہیں تو یہاں کے بڑے بڑے عہدہ داروں کا، اور یہاں کی حکومت کے بڑے بڑے ارکان کا، اور یہاں کی بڑی بڑی سیاسی شخصیتوں کا، یا یہاں کے بڑے بڑے کاروبار اور بنکوں کا، اور کمائی کے جو طریقے ہیں، اور کیریر بنانے کے جو راستے ہیں، ان کا تذکرہ ہوتا ہے، گریجویٹ ہو، فلاں ہو، اور انجینئرنگ کی ٹیکنیشن میں یہ پیدا کرو، اور فلاں چیز میں ٹاپ کرو، اور تم اس میں اول نمبر آؤ تو تم کو پھر یہ نوکری ملے گی، سارا ماحول ہمارے گھروں کا یہ ہے، ضرورت یہ ہے کہ ہمارے گھروں میں دینی ماحول ہو، انبیائے کرام کے واقعات سنائے جائیں، قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرائی جائیں، جیسے ہمارے بچپن میں خدا کے فضل سے دینی خاندانوں میں ہوتا تھا، وہاں تو جہاد اور شہادت کی باتیں ہوتی تھیں، وہاں تو نانیاں اور مائیں اپنے بچوں کو یہ کہہ کر سناتی تھیں، میرے والد کے ایک دوست نے بتایا کہ آپ کے والد صاحب کہتے تھے کہ ہماری نانی صاحبہ جب ہم کو سناتی تھیں تو مومن خاں کا یہ شعر پڑھتی تھیں، مومن خاں

دینی تعلیمی تحریک کا پیغام اور علماء کی ذمہ داریاں

سب سے بہتر الوداعی کلمات

حضرات! اس جلسہ کے اختتام کے موقع پر میرے ذہن میں جو بہت سی چیزوں کا مخزن ہے، بلا کسی معذرت کے کہتا ہوں کہ اس سے بہتر رخصت کرنے کے لیے، اور خود دعا کے لیے، اور تلقین کے لیے، اور پیغام دینے کے لیے، اور اپنے فرض کا احساس کرنے کے لیے، اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کے لیے پوری تحریکی تاریخ میں، دعوتی تاریخ میں، اسلامی تاریخ میں، علمی تاریخ میں اور ادبی تاریخ میں اس سے بہتر الفاظ نہیں ملتے جو آنحضرت (ﷺ) سے منقول ہیں۔

آپ (ﷺ) جب کسی کو رخصت فرماتے تھے تو کہتے تھے: أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَ أَمَانَتَكَ وَ خَوَاتِيْمَ عَمَلِكَ۔ یہ بالکل معجزانہ الفاظ ہیں، جب مسافر رخصت ہوتا ہے تو اس کی صحت کا معاملہ بھی ہوتا ہے، اس کے سامان سفر کا معاملہ بھی ہوتا ہے، وہ اپنے پیچھے گھر کے جن افراد کو چھوڑ کر جا رہا ہے، ان کا معاملہ بھی ہوتا ہے، اس کے مقاصد سفر کا معاملہ بھی ہوتا ہے، یہ سب چیزیں متقاضی ہیں، تقاضا کرتی ہیں کہ ان کے متعلق بھی دعا کی جائے، خدا تم کو تمہارے سفر میں کامیاب کرے، تم کو صحت کے ساتھ لے جائے، صحت کے ساتھ لائے، تمھیں اپنے بچوں کو، اپنے گھر والوں کو تندرست اور صحت مند دیکھنے کا موقع ملے، تمہاری تجارت کامیاب ہو۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب
یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

بتائیے اس گھر کا، اس خاندان کا رنگ کیا ہوگا؟ آج اس رنگ کو خاندانوں میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے، یہ سب مدارس، مکاتب، یہ بالکل مقصود ہیں، اور ہمارے بنیادی مقاصد میں ہیں، اور دینی تعلیمی کورس کا قیام بھی، ان کا قیام اور ان کے دوام اور انہیں کی ترقی کے لیے ہوا ہے، لیکن میں اس کے ساتھ اتنا اضافہ کروں گا کہ گھروں میں وہ ماحول پیدا کیجیے کہ بت پرستی سے نفرت پیدا ہو، خدا کے سامنے کسی کا سر جھکنے سے نفرت پیدا ہو، خدا کے سوا کسی سے ڈرنے سے بھی آدمی ڈرے، اور شرم کرے، اور خدا کے سوا کسی کا نام لینے سے بھی آدمی کو جھجک ہو، وہ ہمارے گھر والے ہیں، اگر یہ ماحول نہ ہوا تو مدارس و مکاتب کی یہ ساری کوششیں — ان کی پوری قدر دانی، ہر قدر دانی کی مستحق بلکہ ان کی ذمہ داری بھی قبول کرنے کے ساتھ میں عرض کرتا ہوں کہ — ناکافی ہوں گی۔

امانت کا مفہوم

تو ایک بات تو یہ، میں آپ نے دیکھی، [illegible] اپنے لیے اور آپ سب کے لیے وہ ذکر کرتا ہوں کہ اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ، اور یہ "امانت" کا لفظ بھی یہاں پر ایک بڑا اہم لفظ ہے، اس کی تشریح نہیں، جو معنی اس میں سب چھپا ہوا ہے، یعنی آپ پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اپنی اولاد کے بارے میں، اپنے خاندان کے بارے میں، اپنی تجارت کے بارے میں، حلال و حرام کے بارے میں، اور شہریوں کے بارے میں، اور ہمسایوں کے بارے میں، ہر چیز کی ذمہ داری ہوتی ہے، یہ سب امانت ہے، تو عربی زبان کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ "امانت" کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں بہت مشکل ہے، میں اعتراف کرتا ہوں باوجود اس کے کہ میں لکھنے کا عادی رہا ہوں، اور شعر و ادب کا رسیا ہوں، اور ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوا ہوں کہ جہاں پر شعراء کے تذکرے لکھے گئے ہیں، اور پھر میں نے عربی زبان عربوں سے پڑھی ہے، یہ میں مجبوری سے کہہ رہا ہوں کہ

میری پوری عربی زبان دانی سے آخر تک سب عربوں سے پڑھی ہوئی ہے، کسی ہندوستانی
کے یہاں چند معمولی سبق پڑھ لیے ہوں تو پڑھ لیے ہوں، اور وہ عرب بھی معمولی عرب نہیں،
بلکہ وہ اس وقت کی دنیائے عرب کے ممتاز ترین معلمین تھے، میں اس کے بعد اعتراف کرتا
ہوں کہ امانت کا ترجمہ میں نہیں کر سکتا، امانت سب پر حاوی ہے، احساس ذمہ داری، فرض
شناسی، خدا ترسی، اور حقوق کی ادائیگی، سب چیزیں اس میں آتی ہیں، یہ کہا جا سکتا تھا،
نبی کے سوا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا اس موقع پر کہ أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكَ وَأَمَانَتَكَ وَخَوَاتِيْمَ
عَمَلِكَ، پھر اس کے بعد خواتیم عملک کہا، اس سفر کا ایک منتہا ہے، اور وہ منتہا وہیں تک رہے
گا، اور اس سفر حیات کا بھی ایک منتہا ہے، اور اس سفر حیات کا منتہا اس سفر کے منتہا سے
کہیں زیادہ اہم ہے، تو ایک تو میں یہ عرض کرتا ہوں۔

اس ملک میں دین کے باقی رہنے کی سب سے بڑی وجہ

اور میں ایک بات اور اپنے فرائض میں سمجھتا ہوں کہ بعض تقریروں میں اور بعض چیزیں
جو پڑھی گئیں، ان میں اس پر زور دیا گیا، توجہ دلائی گئی کہ ہمارے مدارس میں عصری نصاب ہو،
بلکہ یہاں تک کہ اشارے کیے گئے کہ مدارس میں ٹیکنالوجی وغیرہ کی بھی تعلیم ہونی چاہیے،
میں آپ کے سامنے بغیر کسی تواضع کے کہتا ہوں کہ تاریخ اسلام کے ایک طالب علم کے اور
دعوت اسلامی کے ایک طالب علم ہی نہیں، بلکہ مصنف کی حیثیت سے، اور پھر خدا مجھے معاف
کرے اور آپ بھی معاف کریں کہ اس موضوع پر ایک بہت اہم اور ضخیم کتاب لکھنے والے کی
حیثیت سے، یعنی 'تاریخ دعوت و عزیمت' کے مصنف کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ہندوستان
میں اور ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں اسلام کے باقی رہنے کی ایک بہت بڑی وجہ
سلاطین اور دوسرے وسائل ہو سکتے ہیں، لیکن ان کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں ہمیشہ
ایک جماعت ایسی رہی، علماء کی جماعت، داعیوں کی جماعت کہ جنھوں نے دوسروں کو دین
پہنچانے اور دین سکھانے کے سوا اپنی زندگی کا کوئی مصرف اور مقصد سمجھا ہی نہیں، اس کو چاہے
کمزوری پر محمول کیا جائے، چاہے انھوں نے جو کچھ بھی اس کی قیمت ادا کی ہو، لیکن یہاں

ہندوستان میں جو دین باقی رہ گیا، اس وجہ سے کہ یہاں ایسے لوگ رہے کہ جو کہتے تھے کہ ہم سے تو صرف خدا کے یہاں یہ سوال ہوگا کہ تم نے لوگوں کو دین پہنچایا تھا یا نہیں پہنچایا؟

عرب ممالک میں بے دینی کی ایک بڑی وجہ

اور میں آپ سے صاف کہتا ہوں، شاید اس مجمع میں (خدا مجھے معاف کرے) اس مجمع میں کوئی ایسا نہیں ہوگا - اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے، میں مجبوراً کہہ رہا ہوں کہ جس نے ممالک عربیہ کی اتنی سیر کی ہو، ممالک عربیہ میں اتنا وقت گزارا ہو جتنا میں نے گزارا ہے، مختلف حیثیتوں سے، میں آپ کے سامنے شہادت دیتا ہوں کہ آج مصر و شام میں اور عراق میں جو بے دینی پھیل رہی ہے، اور تعلیم یافتہ طبقہ میں جو دین سے انحراف ہے، اور دین سے غفلت ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے - میں نے وہاں رہ کر معلوم کیا - کہ ایسے لوگوں کا قحط ہے یا کمی ہے جو اپنے کو بالکل سو فیصدی دینی دعوت کے حوالے کر دیں، وہ وہاں سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں، اور دوسرے کام سیکھتے ہیں، یورپ جاتے ہیں، وہاں سے ڈگریاں لاتے ہیں، اور Specialize کرتے ہیں، اور وہ سرکاری ملازمتیں کرتے ہیں، ان کو فرصت نہیں ہوتی کہ وہ کوئی خالص دینی تقریر کر لیں، آپ دیکھیں کہ مساجد کے ائمہ خطبے کے اندر کچھ کہہ لیتے ہیں، یا کبھی کوئی مسئلہ ہو تو کہہ لیں، یا جب اخوان المسلمون کی تحریک تھی، میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے، اس وقت دین کے داعی تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا، لیکن اس عنصر کی برابر ممالک عربیہ میں، ممالک اسلامیہ میں کمی ہوتی چلی جا رہی ہے، ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں ایک ایسی جماعت رہی ہے ہمارے مدارس کے فضلاء کی، جو کسی چیز سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں جانتے، ہم تو دین کی دعوت دیتے ہیں، ہم دین کے لیے تکلیف اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔

ایک واقعہ

میں ایک واقعہ لطیفہ کے طور پر آپ کو سناتا ہوں بہت عبرتناک واقعہ ہے، مولانا نجم

جواب دیں؟ خیر میں انھوں نے کہا کہ سب کا جواب مل گیا، ایک چیز کا جواب اور چاہیے کہ
اگر خدا نے قیامت کے دن مجھ سے پوچھا کہ تم رامپور سے بریلی اس لیے گئے تھے کہ وہاں
دس روپے ملتے تھے اور وہاں ڈھائی سو روپے ملتے تھے، تو میں کیا جواب دوں گا؟

دین کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے کی ضرورت

حضرات! میں شہادت دیتا ہوں کہ ہندوستان کو بعض چیزوں میں امتیاز حاصل ہے، یہ
نتیجہ ہے ان لوگوں کی کوششوں کا جو ۲۴ گھنٹے اس کے لیے وقف تھے، اور کسی چیز سے ان کو کوئی
تعلق نہیں تھا، وہ بڑے سے بڑے کسی انتظامی کام میں بھی شریک ہو سکتے تھے، اس کی ذمہ داری
قبول کر سکتے تھے، خدا نے ان کو ذہانت دی تھی، قوت عمل بھی دی تھی، اور لوگ جانتے تھے، اور یہ
جال تو باہر ڈالے گئے، لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہمارا کام صرف دعوت دینا، تبلیغ کرنا
اور پڑھانا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ اسلام سے
کاٹ نہیں سکا، آپ ۱۸۵۷ء کی تاریخ پڑھیں، وہ تاریخ نہیں جو اسکولوں میں پڑھائی جاتی
ہے، اور انگریزوں نے لکھی ہے، بلکہ آپ وہ تاریخ پڑھیں جو قصبوں میں ملتی ہے، ملفوظات
میں ملتی ہے، لوگوں کے حالات میں ملتی ہے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دین جو اس وقت تک قائم رہ
گیا، اور آج یہ مدرسے ہیں اور آج ہم یہاں بیٹھ کر اس آزادی کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں، یہ
نتیجہ ہے ان مخلص علماء کا جنھوں نے فاقے کیے ہیں، اور اپنے پیٹ پر پتھر باندھا ہے، اور اپنے
بچوں کو فاقہ کرایا ہے، لیکن تبلیغ کا کام کیا ہے، دعوت کا کام کیا ہے، اور تعلیم کا کام کیا ہے، اور جس
پورے ذوق کے ساتھ — جس خلوص سے بھی یہ مشورے دیے جاتے ہیں — اس خلوص کا اعتراف
کرتے اور قدر کرتے ہوئے یہ کہوں گا، اور اصرار کے ساتھ کہوں گا کہ دین کے لیے ضروری
ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور جو گویا کچھ اور جانتے نہ ہوں، مجھے
معلوم ہے کہ یہاں کیسے کیسے علماء گزرے ہیں جو کیا کیا جانتے تھے، لیکن انھوں نے صرف
دعوت کے کام سے تعلق رکھا یا تصنیف و تالیف کے کام سے تعلق رکھا۔

میں ایک مدرسہ کے خادم بلکہ کسی حد تک ذمہ دار کی حیثیت سے اعلان کرتا ہوں کہ ہم

سے کم میری زندگی میں اس مدرسہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کوئی ایسا نصاب نہیں آ سکتا، اور
کوئی ایسا نظام جاری نہیں کیا جا سکتا کہ جو لوگوں کو صرف کہیں ملازمت دلا سکے، بلکہ میں
صاف کہتا ہوں اپنے ان طلبہ سے کہتا ہوں کہ میں تمھارے امارات میں اور خلیج میں جانے اور
سعودیہ عرب میں کمانے کے لیے جانے کا مخالف ہوں۔ ہم تم کو اس لیے نہیں پڑھا رہے ہیں
کہ تم جس طرح انگریزی پڑھنے کے بعد جنوبی افریقہ اور انگلینڈ اور برطانیہ اور ان جیسے
دوسرے ممالک جہاں انگریزی بولی جاتی ہے، پہلے جایا کرتے تھے، وہاں جا کر کے بڑی
ملازمتیں حاصل کرتے تھے، اور تنخواہیں پاتے تھے، اب تم اس انگریزی کے بجائے عربی پڑھ
رہے ہو تاکہ تم امارات میں جا کر اور سعودی عرب میں جا کر ملازمت کرو، یہاں جن کو دو سو
ملتے، وہاں ان کو دو ہزار ملیں گے، الحمدللہ ہماری یہاں کے بعض اساتذہ ایسے ہیں (میں اپنی
ذات کے بارے میں نہیں کہتا) کہ جو اگر خط لکھ دیں تو دو ہزار اور پانچ ہزار کی تنخواہ فوراً مل سکتی
ہے، ایسے اساتذہ ہیں جو وہاں معروف ہی نہیں، محترم ہیں، جن کی تحریریں بڑے شوق اور
بڑی قدر سے پڑھی جاتی ہیں، انھوں نے ترجیح دی ہے یہاں رہنے کو تاکہ یہاں دین کی
خدمت کریں، علم کی خدمت کریں، اور ان کے شاگرد معلوم نہیں کیا کما رہے ہیں۔

ائمۂ مساجد کو محکمۂ اوقاف سے تنخواہ دینے کی مخالفت کیوں؟

تو میں صاف پھر ان سے کہوں گا کہ جتنے طلبہ موجود ہیں، کہ ہم تم کو اس لیے نہیں پڑھا
رہے ہیں کہ تم جا کر عرب ممالک میں عربی زبان کو ذریعہ بناؤ اپنی آمدنی کا، اپنی عزت اور
اقبال مندی کا، ہم تمھیں اس لیے پڑھا رہے ہیں کہ تم دین کو اس ملک میں محفوظ رکھنے کے
لیے تم اپنی جان لڑا دو، تم اپنی پوری توانائی اس پر صرف کر دو، اور یہ دین جو اس وقت تک قائم
رہا، وہ اس وجہ سے قائم رہا کہ برابر ایسے لوگ نکلتے رہے کہ جو ایسی معمولی تنخواہوں پر جن کا
تصور بھی اب مشکل ہے، کام کرتے رہے، انھوں نے مسجدوں میں امامت کی، اسی لیے ہم مخالف
ہیں کہ مسجدوں کے اماموں کی تنخواہ محکمۂ اوقاف سے مقرر ہو، ان کو ملنے لگے، اور میرا یہ اعلان، میں
یہ جو کہہ رہا ہوں، اسے وہاں پہنچا دیجیے اور دور دور تک کر دیں، بہت سخت خطرہ محسوس ہوتا ہوں، اسلام کے

خلاف ایک سازش سمجھ رہا ہوں، اور اسلام دشمنی کے مرادف سمجھ رہا ہوں کہ اگر کوئی پڑھا لکھا ہزار کی تنخواہیں ملیں، پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان سے الیکشن میں کام لیا جائے گا، ان سے سیاسی مقاصد حاصل کیے جائیں گے، ان کے ووٹ دلوائے جائیں گے، اور مسجدوں میں وہ بجائے اللہ اور اس کے رسول سے ڈرانے کے، حکومت کی ناراضگی کے امکانات سے، اس کے خطرات سے ڈرائیں گے۔

سب سے ضروری کام

میں اپنے رفقاء سے معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں اس موضوع خاص سے جو اجتماع کا تھا، اس سے ذرا ہٹ کر میں نے یہ بات کہہ دی، اس لیے کہ بات کہی جا رہی ہے، بہت جگہ۔ میں نے سنی ہے، اور میں نے اس کی تردید بھی کی ہے، ہمارے یہ عربی مدارس خاص اپنی تعلیم کے نیچے رہیں گے، اور یہ دین کے فضلاء پیدا کریں گے، داعی پیدا کریں گے، اور جگہ جگہ یہ مکتب قائم کریں گے۔ میں ان سے برابر کہہ چکا ہوں کہ سب سے ضروری کام آپ کا یہ ہے کہ آپ جہاں جائیں وہاں محلے میں وہاں کے لوگوں کو اس پر آمادہ کریں کہ وہ مسجدوں میں مکتب قائم کریں، اپنے گھر پر قائم کریں، اور اپنے گھر میں دینی ماحول پیدا کریں، اور اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں، اور اپنے بچوں کو اس قابل بنائیں کہ قرآن مجید پڑھ سکیں، یہ آپ کا پہلا کام ہوگا، اور پھر کچھ بھی - سب کر رہے ہیں - مگر سب سے ضروری کام یہ ہے کہ آپ یہاں سے جا کر اپنے موضع میں، اپنے گاؤں میں، اپنے محلہ میں اسلامی مکتب قائم کرائیں، اور اردو پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرانے کی کوشش کریں، اور گھروں میں دینی ماحول پیدا کریں کہ بیویاں اپنے بچوں سے دین کی باتیں کریں، وہ باتیں کریں کہ جن سے توحید کی عظمت پیدا ہو، اور کفر و شرک کی نفرت پیدا ہو، اور خدا ترسی، خدا کا خوف پیدا ہو، اور معصیت سے نفرت پیدا ہو، و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔[1]

(۱) دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں ۱-۳ نومبر ۱۹۹۳ء کو منعقد دینی تعلیمی کونسل کی افتتاحی تقریر یہ تقریر قلمبند کرنے کے بعد اب شائع کی جا رہی ہے۔

آیت کا سیاق و سباق بتاتا ہے کہ وہ طبقہ جو اونچا طبقہ ہو، یا اہل علم کا طبقہ ہو، اور جو دینیوں کا طبقہ ہے، وہ خاص طور پر مخاطب ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ "اور ہم تمہاری آزمائش کریں گے ضرور تھوڑے سے خوف سے"۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور رحمت ہے کہ وہ ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ کہہ رہا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کہہ رہا ہے، اللہ کے نزدیک جو بھی بڑے سے بڑے مصائب پیش آتے ہیں، بڑے سے بڑے خطرات درپیش ہوتے ہیں، یہ سب اس کے نزدیک ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ ہے، اس سے تسکین دینی بھی مقصود ہے اور حقیقت بیان کرنی بھی مقصود ہے، کہ بہت بڑی گھناؤنی، مہیب، ہائل اور لرزہ براندام کر دینے والی چیز تو بہت بڑی چیز ہے، اس کا تحمل بھی نہیں، یہ جو مسائل پیش آتے ہیں، جو آزمائش پیش آتی ہے، یہ ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے تسکین بھی دی ہے، اور تیار بھی کر دیا اس کے لیے کہ وہ بہت اہمیت نہ دے کہ ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾ یہ سب الفاظ بتاتے ہیں کہ ﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ﴾ اس کو لفظ "نقص" سے تعبیر کیا، اور اس کو ﴿بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ﴾ سے تعبیر کیا، اور ﴿وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ "اور ان صبر کرنے والوں کو بشارت دیجیے کہ جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ کہ ہم کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے، ہم اللہ کے ہیں، اس کو اختیار ہے جو چیز ہمارے لیے پسند کرے، جس چیز کو ہماری ترقی درجات کا ذریعہ سمجھے، جس چیز کو وہ مصلحت سمجھے، وہ پیش آسکتی ہے۔

مدارس عربیہ کی روایت

عزیزو! جن کے ہم نام لیوا ہیں، اور جن کے وارث ہیں، جن علمائے ربانیین کے ہم وارث ہیں، اور ہم جہاں بیٹھے ہیں، یہ ہمارا مرکز ہے۔ دینی مدارس عربیہ ان کی روایت شروع سے یہی ہے کہ ان کے چوٹی کے علماء نے اور اپنے زمانے کے مجددین، مجتہدین، معلمین اور داعیوں نے، ایسے حالات کا مقابلہ کیا، جو ان کو پیش آئے ہیں، وہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا، سید احمد شہید (رحمۃ اللہ علیہ) کی تاریخ آپ پڑھیں تو بعض دفعہ ایسا ہوا کہ مولانا یحییٰ علی (رحمۃ اللہ علیہ) اور ان کے رفقاء جنگل خانہ میں تھے، ان کو پھانسی کا حکم سنایا گیا، لیکن ان کے چہروں پر ایسی مسکراہٹ تھی کہ انگریز مرد اور لیڈیز جو آئی تھیں، تماشا دیکھنے کے لیے اور Enjoy کرنے کے لیے، گویا لطف اٹھانے کے لیے کہ ہمارے دشمنوں کو پھانسی کی سزا سنائی جائے گی، تو ہمارے سے لیے تفریح کا موقع ہوگا اور خوشی کا، تو دیکھا کہ مولانا جعفر تھانیسری، مولانا یحییٰ علی صادق پوری اور اُن کے جو ساتھی تھے، جب ان کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، اور بالکل معلوم ہوتا تھا کہ خوش خبری کا مژدہ سنایا گیا ہے، تاریخ میں لکھا ہوا ہے، تاریخ کی بات بتا رہی ہے، مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب ''کالا پانی'' پڑھیں، ''سوانح احمدی'' پڑھیں، اور ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' پڑھیں تو یہ واقعہ ملے گا، ان میں سے بعض دریائے حیرت میں ڈوب گئے، بعض قریب آ گئے، بعض عورتوں نے کہا: تم سمجھ رہے ہو؟ اس وقت ہوش میں ہو؟ حواس تمہارے ٹھیک ہیں؟ کیا تم نے سنا کیا کہا گیا؟ کہا: ہم نے سنا ہمیں موت کی سزا دی گئی، کہا: تو تم اتنے خوش کیوں ہو؟ کہا: شہادت کی خوشی میں، تم نہیں جانتے کہ شہادت کیا چیز ہے۔!!

تو ہندوستان کی کم از کم عائلی اور قانونی تاریخ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ سزائے موت دی جاتی ہے، تو بڑی کوشش کی جاتی ہے کہ دریائے شور کی سزا سے بدل جائے کہ کم سے کم اپنی زندگی باقی رہتی ہے اور وہ کالا پانی بھیج دیا جاتا ہے، بہت سے لوگ وہاں برسوں رہ کر آ گئے ہیں، اور جعفر علی تھانیسریؒ ان ہی لوگوں میں سے ہیں جو انڈومان اور کالے پانی گئے تھے، اس کے بعد پھر ان کو معافی دے دی گئی، تو بڑی کوشش کی جاتی ہے اور بڑے اعلیٰ درجے کے وکیل لائے جاتے ہیں کہ قانون داں اس میں کامیابی حاصل کریں کہ سزائے موت کو عبور دریائے شور سے بدل دیا جائے، لیکن پہلی مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہمارے علم میں کہ بغیر کسی قانونی چارہ جوئی اور کوشش کے اس خیال سے سزا بدل دی گئی کہ یہ بہت خوش تھے، ہم ان کو خوش کرنا نہیں چاہتے، اس لیے دریائے شور کی سزا دی جاتی ہے، اور دی گئی، اور مولانا یحییٰ کا وہیں انتقال ہوا، وہیں مدفون ہیں۔ خیر آباد کے ایک بڑے عالم جو ادیب اور شاعر تھے،

مولانا فیض احمد خیرآبادی، ان کا ایک دیوان بھی ہے، وہ ہمارے کتب خانے میں ہوگا، وہیں ان کا انتقال ہوا، ان بزرگوں کا جہاں انتقال ہوا اس کو "کالا پانی" کہا کرتے تھے۔

مدارس اسلامیہ اور جنگ آزادی

میرے عزیزو! یہ ہمارے اسلاف کی روایت چلی آرہی ہے، اور اس سے مختلف اور کم و بیش بہت سے طریقے ہوتے تھے، جو اس وقت کے حق گو علماء کو اور داعیوں کو بڑی سے بڑی سزا دی جاتی تھی، یہاں جو کچھ پیش آیا، یہ بات، یہ پہلو، حکومت کا یہ عمل کتنا بے جا اور ہندوستان کو کتنا نقصان پہنچانے والا ہے، صرف یہی مدارس ہیں جنھوں نے جنگ آزادی میں بڑا حصہ لیا، حضرت شیخ الہند (رحمۃ اللہ علیہ) کون تھے؟ مدرسہ کے آدمی تھے، حضرت مدنی کون تھے؟ مدرسہ کے آدمی تھے، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کون تھے؟ مدرسے کے آدمی تھے، مولانا مدنی، خود مولانا آزاد اس ندوہ میں جب یہ ندوہ دوبارہ گولہ گنج میں تھا، وہاں ندوہ میں چھ مہینے رہے، اور مولانا شبلی کی سرپرستی اور ان کی رہنمائی میں "الندوہ" کے نائب ایڈیٹر تھے، آپ کا اخیر تک تعلق رہا اور وہ مجلس انتظامیہ کے رکن بھی رہے اور ان کا بڑا تعلق تھا یہاں سے۔

لیکن یہ جو پیش آیا اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی، اس میں ہمیں بتایا گیا کہ یہ چیزیں پیش آسکتی ہیں اور یہ کوئی پھولوں کا فرش نہیں ہے بلکہ یہ وہ راستہ ہے جس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی ہیں اور نشیب و فراز بھی ہیں، آپ کو اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور نہ اس سے دل شکستہ ہونا چاہیے، اس میں تو سراسر نقصان پہنچی، معافی کے ساتھ کہتا ہوں حکومت وقت کو اور اس پارٹی کو جو حکومت کر رہی ہے، اس لیے کہ ہندوستان سے باہر کے ممالک میں اس کی بڑی قدر ہے، عالموں کو، اور اہل علم کو اور فضلاء کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور دوسرے کم سے کم اسلامی ممالک میں ہندوستان کا جو تعارف ہے، مؤثر اور وقیع تعارف ہے، وہ ان مدارس عربیہ کی وجہ سے ہے، آپ کہیں چلے جائیے، کسی عرب خطے میں یہاں سے لے کر مراکش تک آپ چلے جائیے، وہاں آپ انھی مدارس کے نام سنیں گے، وہ جانتے بھی نہیں تھے کسی کو، یہاں کے علماء جانتے ہیں کہ ترمذی کی شرح کس نے لکھا۔

کے دل اللہ کا شکر ادا کریں گے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بیٹے بخشے، ان کو بغیر کوئی بڑا ضرر پہنچائے یہ سعادت عطا فرمائی، ان کو اس کا انعام مل رہا ہے، اور آپ یہ بھی یاد رکھیے کہ کلمۂ حق کہنے کے لیے اور صحیح دعوت پہنچانے کے سلسلے میں اور علوم نبویہ اور علوم اسلامیہ اور علوم دینیہ کی حفاظت اور اس کی اشاعت کے سلسلے کی آپ کو آزمائش بھی پیش آ سکتی ہے، اور کم سے کم جو آزمائش آئے، وہ ہے فاقہ کشی اور عسرت کی زندگی، کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کلمۂ حق کہیں اور آپ کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑے، یہ ہمارے اسلاف کی روایت ہے اور یہ چیز قابل مبارکباد ہے، جس کا اثر ہم سب کے دلوں پر ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ کیا اثر ہے، جیسے ہی اس واقعہ کی اطلاع ملی زبانی اور ایک خط کے ذریعہ، کیا حال رہا ہے، دن کس طرح گزرا، رات کس طرح گزری، اس کو آپ بھی سمجھ سکتے ہیں، میں صاف کہتا ہوں کہ انشاء اللہ یہ مدارس رہیں گے، ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس سے اور اللہ کی رحمت متوجہ ہوگی، یہ مدارس ہی ہیں جو بچانے والے ہیں۔

ملک ڈوب رہا ہے

یہ ملک ڈوب رہا ہے، اگر کوئی آواز اٹھتی ہے اس کو بچانے اور راستہ دکھانے کے لیے تو ان ہی مدارس سے اٹھتی ہے، اخلاق کی تعلیم کون دیتا ہے؟ انسان کے احترام کی دعوت کون دیتا ہے؟ پیام انسانیت کی تحریک کہاں سے اٹھی؟ اتنا بڑا ملک تھا، ہزاروں کی تعداد میں سنت اور ان کے یہاں کے فقیر تھے، ان کے یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ یونیورسٹیاں تھیں، کسی کو اتنے بڑے ملک میں توفیق نہیں ہوئی، کہ انسانیت کی تحریک شروع کرتا، اور انسانیت کی آواز بلند کرتا، انسانیت کے پاس ولحاظ، عزت وآبرو کی، انسان کو دیکھ کر خوش ہونے کی، اتنا بڑا ملک تھا، کہیں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، ہمارے مدارس ہی سے یہ آواز اٹھی، خدا کے بڑے عذاب سے بچانے کے لیے اور جو بڑے زلزلے اور عظیم وبا کا شکار ہونے نہیں دیتا، وہ سب برکت ہے قرآن شریف کی، حدیث شریف کی، اللہ کا نام لینے اور حافظوں کی۔

مدارس شفاخانوں سے بھی زیادہ ضروری ہیں

یہ مدارس تو شفاخانوں سے بھی زیادہ ضروری ہیں، ان شفاخانوں سے، مرنا سب کو ہے، ایک مدرسہ پچاس شفاخانوں سے افضل ہے، یہ جو کوتوالیاں ہیں، یہ جرائم سے روکتی ہیں اور مجرمین کو سزا دیتی ہیں، مدارس اس سے بھی زیادہ اہم ہیں، اس لیے یہ مدرسے اور یہاں سے نکلنے والوں کی تقریریں اور ان کی نصیحتیں اور ان کی کوشش، وہ اتنی بڑی تعداد میں مجرمین پیدا ہونے نہیں دیتی جتنی کہ یہاں کی مغربیات، ضمیر فروشی پر آمادہ کرنے والی چیزیں ہیں، جن کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں ہے، جس ملک میں یہ ہو رہا ہے کہ ایک معصوم خاتون جس کو بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لائے تھے، اس کو جلا دیا جائے، اور گلا گھونٹ دیا جائے، اس لیے کہ دس ہزار روپے نہیں لائی، کیوں نہیں لائی؟ اسکوٹر کی فرمائش کی اسکوٹر نہیں لائی، قومی آواز میں میں نے پڑھا اور جائزہ لیا گیا کہ ہر بارہ گھنٹے پر دہلی میں ایک دلہن کو جلا دیا جاتا ہے، جس ملک میں ایسی دولت پرستی ہو کہ پیسے کے لیے سب کچھ کیا جا سکتا ہے، اس ملک کو اگر کوئی چیز بچانے والی ہے تو یہ مدرسے ہیں، یاد رکھیں ہمارے یہاں کے حکمراں، سیاسی لیڈر، فلسفی اور مصنفین کہ اگر یہ مدرسے نہ رہے اور کوئی اللہ سے ڈرنے والا نہ رہا، انسانیت کی کوئی تعلیم دینے والا نہ رہا، تو یہ ملک بچنے والا نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ہے جو اس طرح کے ملک تھے، ان کے صرف تاریخ میں نام رہ گئے ہیں، سمندروں میں ڈوب گئے، زلزلوں اور وباؤں کے شکار ہو گئے، تو خود ایک دوسرے کو مار مار کر اور لڑ لڑ کر مر گئے ہیں، ابھی نسل انسانی بچی ہوئی ہے، قیامت کیوں نہیں آ رہی ہے؟ اس لیے کہ ابھی اللہ کا نام زندہ ہے، اللہ کا نام لینے والے زندہ ہیں، انسان کو دیکھ کر خوش ہونے والے زندہ ہیں، اور پیسے کی حقیقت بتانے والے زندہ ہیں، اس ملک کا اصلی معبود پیسہ ہے، یہاں کی تاریخ بتاتی ہے کہ بچپن سے کس طرح دولت کی پوجا اور تعلیم دی جاتی ہے، اگر عقل ہوتی، سمجھ ہوتی اور انصاف ہوتا تو ان مدرسوں کو سینے سے لگاتے اور ان کی تحریروں کو چومتے اور آنکھوں سے لگاتے کہ یہ مدرسے جو کچھ ہم ان کی خدمت کر سکیں کریں، اور ہم چاہے جس پر ہاتھ اٹھائیں، کسی پر شک

ڈاکٹر خان کی طرف سے یہ خط آیا ہے کہ لوگوں نے اس تحریک میں جو نقصان اٹھایا اور ان کا جو تلف ہوا آپ ان کی فہرست دیجیے، حکومت کی طرف سے اس کو ادا کیا جائے گا۔ انھوں نے جواب لکھا کہ جو کچھ اللہ کے لیے چھوڑا تھا، اس کو نہیں لیں گے۔

یہ کوئی ہندوستان میں جو یہ کہے کہ لاکھوں اور کروڑوں کی جائداد ضبط کرلی گئی، تجارت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، لاکھوں اور کروڑوں روپیہ ہوتے، انھوں نے کہا نہیں! جو اللہ کے لیے کیا تھا اس کو نہیں لیں گے۔

بس میرے بھائیو! وہ آپ کے اسلاف تھے، آپ ان کے اخلاف ہیں، ہم آپ تم سے کام نہیں لیتے، کہ یہ مرحلے بار بار پیش آئیں، نسأل اللہ العافیۃ.

اس واقعے کو زیادہ اہمیت نہ دیں، بلکہ سمجھیں کہ یہ سعادت بھی اللہ نے ہمیں عطا فرمائی، یہ تاسف کی اور ناخوشی کی بات ہے، اللہ کے یہاں اس کا اجر ملے گا، آپ عزیمت کے لیے تیار رہیں۔ ہمارا دین رخصتوں کا مجموعہ نہیں ہے، اس میں رخصتیں بھی ہیں اور عزائم بھی، آپ کو عزیمت کے ساتھ دین کی نشر واشاعت کرنے کی فکر کرنی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کی تعلیم بھی دینی ہے، حب وطن اور ملک کے ساتھ وفاداری کی بھی تعلیم دینی ہے، لیکن سب دینی اور اخلاقی روح کے ساتھ، اللہ سے ثواب کی امید میں، اور جو کچھ پیش آئے اس کو برداشت کرنے کے ساتھ۔ اس پر ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ہر قسم کے مکارہ سے محفوظ رکھے، اپنے راستے پر اور اپنے نبی (ﷺ) کے راستے پر قائم رکھے، عزیمت کے ساتھ اس دین اور تعلیم کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اللہ کے راستے اور رسول (ﷺ) کی اتباع اور اولیائے عظام، شہدائے کرام پر رشک کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ہر طرح کے خوف سے، گھبرانے سے بچائے۔ آمین!!![1]

---

(۱) نومبر ۱۹۹۴ء میں ندوۃ العلماء پر پولیس یورش کے بعد حضرت مولانا تشریف لائے تھے۔ یہ تحفظ تحریک والے تو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں طلبہ، اساتذہ، منتظمین اور شہریوں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی میں یہ تقریر فرمائی، ماخوذ از "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ نومبر ۱۹۹۴ء)۔

بنگلہ دیش میں اہل علم وفکر کی ذمہ داری

بنگلہ زبان میں مہارت وقیادت

حضرات اہل علم وفکر، مدرسین واساتذہ، طلبائے عزیز!

ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے

آپ کا پہلا فرض یہ ہے کہ ملک کا رشتہ اسلام سے کمزور نہ ہونے پائے، جس ملک کو اللہ نے آپ کے لیے انتخاب کیا ہے، اس کے بارے میں آپ کو خدا کے یہاں جواب دینا ہوگا، اگر اسلام سے اس کا رشتہ کمزور ہوگیا اور ملک کے اندر خلاف اسلام رجحان پیدا ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ اور آپ کا گریبان ہوگا، سیاسی لوگوں سے پوچھا جائے گا یا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے، ہم نہیں کہہ سکتے، لیکن سب سے پہلے علماء سے سوال ہوگا کہ تمہارے ہوتے ہوئے ملک میں اسلام کیسے خطرہ میں پڑا؟ حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) فرماتے تھے: میرے ہوتے ہوئے دین کمزور ہو جائے، یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ کو تمام جزوی ذیلی اختلافات کو ختم کر کے اس مقصد پر متحد ہونا چاہیے کہ آپ اس ملک کی رہنمائی کریں، آپ اس ملک کے اس طبقہ کو متاثر کریں، اپنے اخلاص سے اور اپنے ایثار سے، جس کے ہاتھ میں زمام اختیار ہے یا آنے والی ہے، جنہوں نے اس کی تیاری کی ہے، جن کے پاس وہ وسائل و اسلحہ ہیں جن کے ذریعہ سے اس زمانہ میں آدمی کو اقتدار حاصل ہوا کرتا ہے، آپ کا یہ فرض ہے کہ اس طبقہ سے رابطہ پیدا کریں، آپ ان کی زبان میں ان کو سمجھائیں، آپ کے متعلق ان کا یہ تجربہ ہو جائے کہ آپ بے غرض ہیں، آپ ان سے اپنے لیے کچھ نہیں چاہتے ہیں، آپ کو وہ

بڑی سے بڑی رشوتیں دینا چاہیں، آپ کو بڑے سے بڑے مواقع دینا چاہیں، آپ کہیں: نہیں! ہمیں کچھ نہیں چاہیے! آپ دین کی خدمت کریں۔

بنگلہ زبان میں مہارت پیدا کیجیے!

دوسری بات یہ ہے (ماشاء اللہ پڑھے لکھے لوگوں کا مجمع ہے، اس لیے میں کہتا ہوں) کہ یہاں کی زبان (بنگلہ زبان) کو آپ اچھوت نہ سمجھیے، بنگلہ زبان کو آپ یہ نہ سمجھیے کہ اس کے پڑھنے لکھنے میں کوئی ثواب نہیں ہے، یا عربی میں ثواب ہے یا اردو میں ثواب ہے، آپ کو بنگلہ زبان میں مہارت پیدا کرنا چاہیے، بنگلہ زبان میں آپ اچھے لکھنے والے بنیے، آپ ادیب بنیے، مصنف بنیے، مقرر بنیے، آپ کی زبان میں مٹھاس ہو، رس ہو، آپ کی زبان ایسی ہو کہ لوگ غیر مسلم ادیبوں کی تحریر پڑھنے کے بجائے آپ کی تحریریں پڑھیں اور مست ہوں، اور جھومیں، یہ بات لکھ کر رکھنے والے کی زبان سے سنیے، دلی کی زبان بولنے والے کی زبان سے سنیے اور عربی پر جان دینے والے کی زبان سے سنیے، اس وقت تک جو عمر گزری ہے، عربی زبان کی خدمت میں، اور ان شاء اللہ بقیہ عمر بھی گزرے گی، عربی ہماری زبان ہے، ہم عربی کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں، الحمد للہ! ہم تو ہم ہمارے بعض عزیز بچے بھی ایسے ہیں جو کسی طرح عربوں سے کم نہیں ہیں، وہ شخص آپ سے کہہ رہا ہے جو عربی زبان کا کیڑا ہے، اور اردو زبان جس کے گھر کی زبان ہے، وہ آپ سے کہہ رہا ہے کہ بنگلہ زبان کو غیر مسلموں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیے، ان کے حوالہ نہ کیجیے کہ لکھیں وہ پڑھیں آپ، یاد رکھیے قلم کے ساتھ اثر آتا ہے، لوگوں نے تو یہ کہا کہ کتاب اگر کسی صاحب ایمان کے قلم سے لکھی ہوئی ہے تو ایمان کا کرنٹ دوڑ جاتا ہے، حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ خطوط کے ذریعہ سے بھی توجہ دی جاتی ہے، جب کوئی شیخ توجہ سے خط لکھتا ہے تو اس خط میں تاثیر ہوتی ہے، اور ہم نے اس کا تجربہ کیا ہے، اور آج ان مصنفین کی کتابیں موجود ہیں، جو ان کی کتاب پڑھ لے اس کی نماز دل کی کیفیت بدل جاتی ہے، کتاب کا نماز سے کوئی تعلق نہیں، کتاب کسی اور موضوع پر ہے، لیکن جب وہ صاحب لکھ رہے تھے یا بول رہے تھے تو قلب ان کا متوجہ تھا، آج ان کی کتابیں پڑھیے، ان کی

تحریر پڑھیے تو آپ اس کے بعد نماز پڑھیں گے، ذرا بھی آپ کا احساس اور قلب بیدار ہے تو آپ محسوس کریں گے کہ اس کی کیفیت دور ہے۔ میں نے بارہا اس کو محسوس کیا ہے۔

آپ غیر مسلموں کی کتابیں پڑھیں، ان کے افسانے پڑھیں، ان کی کہانیاں پڑھیں، ان کی تاریخ لکھی ہوئی پڑھیں، اور آپ پر اثر نہ پڑے؟ ضرور پڑے گا، یہ بہت بڑی کم ہمتی کی بات ہے، آپ لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ جو مسلمان ادیب اور شاعر گزرے ہیں، ان کو آپ نمایاں کریں، آپ خدارا اسلام کو نمایاں کیجیے، آپ ان کی تحریریں پڑھیے، اور ان کے ترجمے کیجیے، اللہ تعالیٰ صلاحیت دے تو ان کا کلام عربی میں پیش کیجیے، یہاں کئی ادیب گزرے ہیں، مثلاً عبدالغفور نساخ، ان کا نام میں نے اردو ادب کی تاریخ میں پڑھا تھا، اور کئی شاعر گزرے ہیں، ان لوگوں کے حالات لکھیے، دنیا کو بتائیے کہ یہاں کیسے کیسے شاعر گزرے ہیں، خدا کے فضل و کرم سے کوئی جوہر، کوئی کمال ایسا نہیں جو آپ کو عطا نہ ہو، ہمارے مدرسہ میں تو بعض بعض بنگالی طالب علم ایسے ذہین تھے کہ رشک آتا تھا، اور ہمارے یوپی اور بہار کے طالب علم ان کے سامنے مات تھے، عربی سپاس نامے میں سنتا چلا آ رہا ہوں، مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اتنی اچھی عربی لکھنے والے یہاں موجود ہیں، ابھی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائیے گا، خدا نے آپ کو سب جوہر دیے ہیں، مگر اس کا صحیح استعمال نہیں۔

میری بات یاد رکھیے کہ بنگلہ زبان کی قیادت اپنے ہاتھ میں لیجیے، دو قسموں سے، ایک غیر مسلموں سے، ایک غیر اسلامی سے، دو قسمیں ہیں، ایک غیر مسلم ہے، ایک غیر اسلامی ہے، غیر اسلامی مسلمانوں میں بھی ہوتے ہیں، غیر مسلم غیر مسلموں میں ہوتے ہیں، غیر مسلموں سے، غیر اسلامیوں سے، دونوں سے قیادت اپنے ہاتھ میں لیجیے، اور اس میں ایسا کمال پیدا کیجیے کہ لوگ ان سے مستغنی ہو جائیں۔ الحمد للہ ہمارے یہاں کے علماء نے اس کی طرف توجہ کی، ادب، تنقید، تاریخ، تصنیف میں ان کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلا، ایک مرتبہ ادبی مقابلہ تھا، ایک بڑے اردو رسالہ کی طرف سے کہ اردو کا سب سے بڑا انشاء پرداز کون ہے، سب سے بڑا انشاء پرداز، تمام ان لوگوں نے یہ ثابت کیا کہ مولانا شبلی نعمانی اردو کے سب سے بڑے انشاء پرداز تھے، جب کوئی بڑا مقتدر جلسہ ہوتا تو مولانا سید سلیمان ندویؒ کو،

نہیں، پہلا کام ہے اسلام کو باقی رکھنا، اسلام کا رشتہ اس قوم سے جوڑے رکھنا، دوسری بات ہے قیادت کا مقام حاصل کرنا، قیادت کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ کو بنگلہ پر عبور نہ ہو، میں نے کل کے استقبالیہ جلسہ میں جس میں اسلامک فاؤنڈیشن نے استقبالیہ دیا تھا، کہا کہ مجھے افسوس ہے اور شرم آرہی ہے کہ میں آپ سے بنگلہ میں بات نہیں کر سکتا، میں خوش ہوتا اگر میں آپ کے سامنے بنگلہ میں تقریر کرتا، ہمارے یہاں اسلام میں کوئی زبان غیر نہیں ہے، سب زبانیں خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں، اور ایک سے ایک زبان بڑھی ہوئی ہے، زبان کے خلاف تعصب بالکل جاہلانہ بات ہے، نہ کوئی زبان پرستش کے قابل ہے، نہ کوئی زبان نفرت کے قابل ہے، اگر مقدس زبان کوئی ہو سکتی ہے تو عربی زبان ہے، باقی سب زبانیں یکساں ہیں، اللہ نے انسانوں میں بولنے کی صلاحیت پیدا کی اور سیکڑوں برس میں ان زبانوں میں ترقی ہوئی، اور اب وہ ہمارے پاس ترقی یافتہ شکل میں پہنچیں، ہم ان کی قدر کرتے ہیں، اور ہمیں اظہار خیال کے لیے ان سے مدد ملتی ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت زید بن ثابتؓ کو عبرانی زبان پڑھنے کا حکم دیا جو صرف یہودیوں کی زبان تھی، اگر ہم زبان و ادب کی طرف سے بے اعتنائی برتیں گے تو غیر اسلامی عناصر ان پر اپنی اجارہ داری قائم کرلیں گے، اور اس سے بڑا نقصان پہنچے گا، کلکتہ سے کتابیں آتی ہیں، مسموم کمیونزم کی پرچار کرنے والی، قومی و لسانی تعصب کی پرچار کرنے والی، ہندو میتھالوجی کی پرچار کرنے والی، اور بڑے شوق سے ہمارے نوجوان پڑھتے ہیں۔

اصل مسئلہ ارتداد کا مقابلہ ہے

بھائی! اگر آپ کو ترمذی کی شرح لکھنی ہو اور مشکوٰۃ کی شرح لکھنی ہو اور کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرنا ہو، اس کو آپ اردو میں لکھیے یا عربی میں لکھیے، اگر آپ کو عوام سے باتیں کرنی ہوں تو عوام کی سطح پر بات کیجیے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ ہندوستان پاکستان میں بہت کام ہو چکا ہے، کتب حدیث کی شرحیں لکھی جاچکی ہیں، مذہب حنفی کو حدیث کے مطابق ثابت کیا جاچکا ہے، اب اس کے لیے کسی نئی بڑی کوشش کی ضرورت نہیں ہے، حضرت مولانا انور شاہ

صاحبؒ اور حضرت مولانا ظہیر احسن شوق نیمویؒ یہ سب کام کرچکے ہیں، انہوں نے ثابت کر دیا کہ یہ دعویٰ کہ حنفی حدیث کے خلاف کہتے ہیں، غلط ہے، اور ان سے پہلے طحاویؒ نے ''معانی الآثار'' میں، زیلعیؒ نے احادیث ہدایہ کی تخریج ''نصب الرایہ'' میں اور دوسرے حضرات نے بھی یہ کام بڑے اعلیٰ پیمانے پر کیا ہے، اب نیا میدان ہے جس کی طرف آپ کو توجہ کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ لوگ آپ کے اثر سے نکلنے نہ پائیں، وہ آپ کو یہ نہ کہیں کہ آپ اس ملک میں رہ کر کے بھی غیر ملکی ہیں، اس ملک میں رہ کر کے آپ پردیسی ہیں۔ آپ کو تو اس ملک کے ساتھ اپنے کو وابستہ کرنا چاہیے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

''إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا ... فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ.''(1)

''اے مسلمانو! تمہارا خون، تمہارے مال، تمہاری عزت وآبرو ایک دوسرے پر حرام ہے، جیسے آج کا (عرفہ کا) دن اس شہر (مکہ) کے حدود میں اس مہینہ (ذی الحجہ) میں جو حرمت کا مہینہ ہے''۔

مسلمان کو تکلیف دینا حرام اور اس کا خون بہانا ظلم عظیم ہے

زبان کے لیے کسی مسلمان کی توہین کرنا، مسلمان کے دل کو دکھانا، مسلمان کا خون بہانا ناجائز اور ظلم عظیم ہے، نہ زبان پر سختی کے قابل ہے نہ نفرت کے قابل ﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾ [سورۃ الطلاق:۳] اللہ نے ہر چیز کا ایک پیمانہ بنایا ہے۔ اس کا بھی ایک پیمانہ ہے، محبت کرو، کمال پیدا کرو، زبان وشاعری کا لطف لو۔ اس کا ذائقہ لو، نہیں نمونہ کرو، خدا کی کتاب کو بھی اگر کوئی پوجنے لگے تو مشرک وکافر ہو جائے گا۔ اگر قرآن کو کوئی سامنے رکھ کر (اس کو معبود سمجھ کر) سجدہ کرے تو مشرک ہوگا، عبادت صرف خدا کی ہے، لیکن سب زبانوں سے محبت کرنا اور اس میں مہارت حاصل کرنا اور سب کا حق دینا معقول ہے۔

(1) جزء من حديث أخرجه البخاري في كتاب الحج باب الخطبة أيام منى بحديث رقم:۱۷۳۹

میرے عزیزو! اگر یہ باتیں ہماری یاد رہیں تو ان شاء اللہ کسی دن یاد کرو گے کہ کیا کہا گیا تھا ﴿فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾ [سورة غافر: ٤٤]

"جو باتیں میں تم سے کہتا ہوں تم آگے چل کر یاد کرو گے، اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں، بے شک خدا بندوں کو دیکھنے والا ہے۔"

فرشتے بھی سن لیں اور کراماً کاتبین بھی سن لیں کہ ہم حجت پوری کر رہے ہیں اس ملک کے رہنے والے مسلمانوں پر، کہ اگر تمہیں اس ملک میں رہنا ہے، اسلام کو باقی رکھنا ہے تو یہ راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے۔[1]

---

(۱) جامعہ امدادیہ کشور گنج (بنگلہ دیش) میں ۱۳/ مارچ ۱۹۸۴ء کو کی گئی تقریر، ماخوذ از "تحفۂ مشرق" صفحہ ۲۲۴ تا ۲۴۲۔